آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے ۔ لو تمھیں طورِ تسلی کا بتایا ہم نے

ریویو آف ریلیجنز

یعنی

دنیا کے مذاہب پر نظر

جلد (٦) — بابت ماہ نومبر ۱۹۰۷ء — نمبر (۱۱)

فہرست مضامین

قادیان ضلع گورداسپور سے ۲۰ نومبر ۱۹۰۷ء کو مینیجر میگزین کے اہتمام سے شائع ہوا چندہ سالانہ عہ

مندرجہ ذیل کتابیں دفتر میگزین قادیان ضلع گورداسپور سے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ مل سکتی ہیں ان کا مطالعہ مذہبی تحقیقات اور تاریخی معلومات اور مخالفین کے اعتراضات کی تردید کے لیے نہایت ضروری ہے۔ مشرح فہرست ۱ر کا ٹکٹ بھیجنے پر ارسال خدمت ہوگی

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
انوار اللہ اردو	۸ر	قاعدہ عربی اردو	ار	تذکرۃ الشہادتین اردو	۵ر	شہادۃ القرآن اردو	۴ر
اجرومیہ عربی	۰ر	قرآن شریف مترجم مع تفسیر حسینی	عہ	" فارسی	۳ر	صیان القرآن "	۳ر
الذکر یعنی ترجمہ نماز و اسمائے الٰہیہ	۲ر	مسک العارف اردو	۱۰ر	تحفہ قیصرہ اردو	۲ر	کشف الغطاء "	۲ر
پارہ الٓمٓ عربی	۲ر	نشان آسمانی "	۲ر	تحفۃ الندوہ "	۰ر	لغات القرآن حصہ اوّل	عہ
پنج ارکان اسلام۔ اردو	ار	واقعات صحیحہ "	۲ر	تقریریں "	۲ر	" حصہ دوم	عہ ۸ر
تفسیر جلالین عربی	عہ ۸ر	یسرنا القرآن حصہ اوّل	ار	تقریروں کا مجموعہ "	۳ر	لیکچر سیالکوٹ اردو	۱ر
تفسیر فوز الکبیر۔ عربی فارسی	۲ر	" دوم	ار	سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب "	۲ر	" لاہور مہوتسو "	۴ر
تقریر جلسہ مذاہب جیبی تقطیع اردو	۲ر	" سوم	ار	جنگ مقدس عیسائیوں سے مباحثہ	۶ر	مشکوٰۃ الانوار عربی	۴ر
جام شہادت۔ اردو	۰ر	ہدیہ ثاقب اردو	۲ر	حمامۃ البشریٰ عربی	۸ر	مواہب الرحمٰن "	۴ر
حمائل مترجم۔ فارسی	عہ	الہدیٰ عربی	۶ر	حجۃ الاسلام اردو	ار	مبادی الصرف	۱ر
رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب اردو	۸ر	الحق لدھیانہ اردو	۶ر	خطوط شیعہ کا جواب "	۲ر	نسیم دعوت اردو	۳ر
سلسلہ دینیہ۔ اردو	ـہ ر	" دہلی۔ "	۸ر	خطبہ الہامیہ عربی ترجمہ فارسی اردو	عہ	نور الدین حصہ اوّل اردو	۲ر
سلاسل القرأۃ۔ عربی نمبر۱	۴ر	اعجاز احمدی۔ عربی	۳ر	خلافت راشدہ حصہ اوّل "	۸ر	" " دوم "	۴ر
" نمبر۲	۸ر	احسن الکلام اردو	سر	" " دوم "	۴ر	ہدیہ سعدیہ عربی	۲ر
" نمبر۳	۱۳ر	ابطال الوہیت مسیح "	ار	خزینۃ المعارف حصہ اوّل دوم	۴ر	فصل حق۔ اردو	ار
" نمبر۴	۱۳ر	آیات الرحمٰن "	۸ر	" " سوم چہارم	۸ر	سیرۃ المسیح "	۸ر
آریہ دھرم۔ اردو	۴ر	دعوت الحق۔ "	۵ر	اعلام الناس حصہ دوم	۴ر	آسمانی فیصلہ "	۲ر
		شرح ترمذی نمبر۱	عہ ۸ر				
دینیات کا پہلا رسالہ "	ار	" نمبر۲	عہ ۸ر	دعوت دہلی اردو	۱۰ر	دافع البلاء "	ار
طریق النجات نمبر۱	۸ر	احمدی کا من نظم پنجابی	ار	دعوت الندوہ "	۱۰ر	غنیۃ الطالب۔ عربی	عہ
" " نمبر۲	۷ر	براہین احمدیہ حصہ اوّل	۵ر	راز حقیقت۔ "	ار	شفاء السقام "	عہ
" " نمبر۳	۸ر	" " دوم	۴ر	سرمہ چشم آریہ "	۱۲ر	نوٹ۔ ان قیمتوں میں محصول ڈاک شامل نہیں۔	
" " نمبر۴	۱۵ر	" " سوم					
عسل مصفّٰی اردو	عہ ۸ر	" چہارم*	عہ	ست بچن "	۱۰ر		
		تکمیل براہین	سے				

مکمل براہین احمدیہ جس میں جلد چہارم [illegible] ہے [illegible] دفتر میگزین سے مل سکتی ہے۔

* براہین احمدیہ کا حصہ چہارم اصل نسخہ سے جو حضرت اقدس نے [illegible]ء میں چھپوایا تھا۔ باقی تین حصے بڑے اہتمام سے دوبارہ چھپوائے گئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

قرآن کریم کی حفاظت

۹ - ناسخ و منسوخ کی بحث

ہمارے ناظرین کو یاد ہو گا کہ گذشتہ رسالہ میں اسی عنوان کے مضمون کے ذیل میں ہم نے چند حدیثیں نقل کی تھیں اور وعدہ کیا تھا کہ ان کے متعلق آیندہ پرچے میں ہم مفصل بحث کریں گے ہم آج یہ مضمون اسی امر کے متعلق لکھتے ہیں اور اس میں ان ساری حدیثوں پر ایک ایک کر کے بالترتیب بحث کرنیکا ارادہ کرتے ہیں سب سے پہلی حدیث حضرت ابن عمر سے ایک روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا تھا کہ فدیۃ طعام مسکین والی آیت منسوخ ہے صحیح بخاری میں سلمہ بن اکوع سے اسی مضمون کی ایک اور حدیث بھی ہے۔ یعنی یہ کہ انہوں نے بھی فرمایا تھا کہ فدیۃ طعام مسکین والی آیت منسوخ ہے۔ اب ان دونوں کے خلاف ایک تیسری حدیث ہے جو وہ بھی صحیح بخاری میں ہی مذکور ہے جس میں حضرت ابن عباس سے یہ روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ فدیۃ طعام مسکین والی آیت منسوخ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ حدیث بخاری کی اس جگہ لکھی جاتی ہے۔ اور وہ یہ ہے قال ابن عباس لیست بمنسوخۃ ھو الشیخ الکبیر و المرأۃ الکبیرۃ لا یستطیعان ان یصوما فلیطعمان مکان کل یوم مسکینا جس کا ترجمہ یہ ہے "ابن عباس نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت جو روزہ رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتے انکو چاہیئے کہ اپنی بجائے ہر روز ایک مسکین کو کھانا دیا کریں"۔ اسی طرح ابو داؤد میں حضرت ابن عباس سے اسی آیت کے متعلق دو حدیثیں مروی ہیں ان دونوں حدیثوں میں وہی مضمون ہے جو بخاری کی مندرجہ بالا حدیث میں ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک حدیث کا یہ مضمون ہے کہ آیت وعلی الذین یطیقونہ فدیہ طعام مسکین۔ میں ان بوڑھے مردوں اور عورتوں کو جو روزہ رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتے اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر روزے

بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں اور اسی قسم کی اجازت حاملہ اور بچے والی عورتوں کیلیے ہے کہ جب انہیں جنین یا بچے کو روزہ کی وجہ سے صدمہ پہنچنے کا احتمال ہو وہ بھی روزہ نہ رکھیں اور صرف ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں چنانچہ وہ حدیث یہ ہے۔ عن ابن عباس وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين قال كانت رخصة للشيخ الكبير والمرأة الكبيرة وهما يطيقان الصيام ان يفطرا ويطعما مكان كل يوم مسكينا والحبلى والمرضع اذا خافتا قال ابو داؤد يعني على اولادهما افطرتا واطعمتا۔ اب ایک طرف ابن عمر کا قول ہے اور اسکے مقابل ابن عباس کا قول ہے۔ ایک ہی آیت کو ایک صحابی منسوخ بیان کرتا ہے اور دوسرا اُسی آیت کو غیر منسوخ بیان کرتا ہے۔ یہ اختلاف اس بات کا قطعی طور پر فیصلہ کر دیتا ہے کہ صحابہؓ کی اس امر میں رائے وحی یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر مبنی نہ تھی بلکہ صاف عیاں ہو رہا ہے کہ انکی رائیں بعض آیات کے قیاسی معنے سمجھنے پر مبنی تھیں۔ حضرت ابن عمر آیت کے ایک طرز پر معنے کر کے قیاس کرتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ ابن عباس اسی آیت کے دوسری طرح پر معنے کر کے فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں گویا وہ ابن عمر کے قول کی تردید کرتے ہیں۔ الغرض یہ بات قطعی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اگر کسی صحابی نے کسی آیت کو منسوخ خیال کیا تو اسکی بنا وحی الٰہی پر نہ تھی بلکہ محض اس صحابی کے قیاس پر تھی۔ مگر چونکہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت وحی الٰہی سے نازل ہوئی ہے اس لیے کسی قرآنی آیت کو کسی صحابی کی محض قیاسی رائے پر منسوخ نہیں سمجھا جا سکتا جبتک کہ وہی ذرایع جو اس کے منجانب اللہ نازل ہونے پر ایمان دلانیکا موجب ہوئے ہیں اس کے نسخ کا حکم نہ دیں۔ جیسے ابن عمر نے آیت زیر بحث کے اپنی طرز پر خاص معنے کیے اور ابن عباس نے انکی غلطی ظاہر کی اور آیت کے منسوخ ہونیکو باطل ٹھہرایا اسی طرح اگر کوئی اور شخص کسی آیت کے معنے ایسے کر دے جس سے اس کا کوئی تعارض دوسری آیات سے نہ رہے تو اس سے کوئی نقص لازم نہیں آتا اور جب آیات کے معنوں کا تعارض دُور ہو گیا تو ان کے منسوخ ہونیکا خیال خود ہی باطل ہو جائیگا۔ اس سارے سلسلہ واقعات سے یہ بات بدیہی طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ جن لوگوں نے کسی آیت کو منسوخ مانا ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ خدا کی وحی نے ایسا ہی ظاہر کیا تھا۔ بلکہ انکے اپنے قیاس ہی کی غلطی انہیں ایسے اعتقاد پر قایم کرنے کی محرک ہوئی۔ اس طرح سے کہ انہوں نے اس آیت کی قیاسی تاویل ایسی سمجھی جو اس کے اصل مفہوم سے دُور تھی اور پھر وہ تاویل کسی دوسری آیت کے معانی کے معارض پڑی۔ پس انہوں نے اپنی قیاسی تاویل کی اصلاح کی طرف توجہ نہ کی بلکہ اُلٹے اس آیت کو یا آیت معارض کو منسوخ قرار دیدیا۔ حالانکہ غلطی تو انکے اپنے قیاس کی تھی۔ ہم یہ بات اپنے پاس سے نہیں کہتے بلکہ بڑے بڑے فاضل علماء جنہوں نے قرآن شریف کے معنے سمجھنے میں بہت مجاہدات کیے ہیں ان قیاسی تاویلات کی غلطی کو ہمیشہ بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ پہلے زمانہ کے بعد اسلام کی تاریخ پر ایک زمانہ ایسا آیا کہ لوگوں کو قرآن شریف کی تفسیر نویسی کا بہت

شوق ہوگیا۔ چونکہ یہ ایک بہت اہم کام تھا اور اس کا اتمام ایک ہی زمانہ میں اکمل اور اصح طور پر کسی انسان سے ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے مفسرین کو بعض آیتوں کے سمجھنے اور تفسیر کرنے میں بڑی بڑی دقتیں پیش آتی رہیں. بعض مفسروں کی عادت اسی طرح رہی کہ جہاں کہیں کسی آیت کے معنے سمجھنے میں مشکل پیش آئی وہاں نسخ کا عذر لکھکر آگے چلدیئے۔ یہانتک کہ بعضے مفسروں نے توسیکڑوں آیتوں کو اسی عذر پر منسوخ لکھ مارا۔ پہلے خودہی بعض آیتوں کے غلط معنے قیاسی طور پر تجویز کر لیتے اور پھر جب وہ دوسری آیات کے معارض پڑتیں تو انکو منسوخ قرار دیدیتے۔ حتیٰ کہ یہ عام عقیدہ ہوگیا اور بجائے اصلیت کی طرف توجہ کرنیکے آیتوں کو منسوخ قرار دینے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے لگے۔ مگر آخر کار بعض لوگوں کو اس طرف بھی توجہ ہوئی اور خود انہیں میں سے ایسے لوگ ہوتے رہے جو انکی غلطیوں کو منکشف کرتے رہے۔ یہانتک کہ جلال الدین سیوطی نے بھی باوجود نادر پسندی کے اس مسئلہ کی ایک حدتک تردید کی اور سوائے اکیس آیتوں کے باقی آیات کی نسبت جس کسی نے منسوخ ہونیکا خیال کیا تھا اسکو غلط قرار دیکر اسکی تردید کی۔ پھر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے ان اکیس آیتوں پر بھی جب تحقیق کی نظر کی تو ان میں سے صرف پانچ آیتوں کے معنوں میں ایسی دقت سمجھنے کی وجہ سے انکو منسوخ ماننا پڑا اور باقی سولہ آیات کی نسبت محقق سیوطی کے خیال کی تردید بزور دلایل قطعیہ کی۔ اور لکھا کہ فاضل سیوطی نے انکے معنے سمجھنے میں غلطی کھائی ہے۔ غرض نسخ کے مسئلہ کے متعلق عقیدہ رکھنے کا سارا لب لباب ان پانچ آیتوں میں محدود ہوگیا۔ پھر جب ہم ان رہی ہوئی پانچوں آیتوں کے معانی کیطرف نہایت عمیق نظر سے توجہ کرتے ہیں تو ہم کو صاف نظر آجاتا ہے کہ یہ آیات بھی منسوخ نہیں بلکہ انکی تاویل اور معنے کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اگر ہم انکے صحیح معنے اختیار کریں تو پھر صاف نظر آجاتا ہے کہ یہ آیات کسی کی معارض نہیں پڑتیں اور اس لیے انکے منسوخ ہونیکا اعتقاد رکھنا غلطی پر مبنی ہے۔ اس لیے قبل اسکے کہ ہم نفس مضمون کی طرف توجہ کریں یہ امر ضروری نظر آتا ہے کہ جن آیات میں آخر کار گھبرا کر منسوخ ہونیکا اعتقاد محدود ہوجاتا ہے انکی نسبت یہ ثابت کردیا جائے کہ وہ آیات غلط تاویل کی وجہ سے منسوخ سمجھی گئی ہیں والا درحقیقت اپنے صحیح مفہوم اور تاویل کے ساتھ وہ کسی آیت قرآنی کے مفہوم کے معارض نہیں پڑتیں اور اس لیے وہ بھی منسوخ نہیں۔ اس کا یہ فایدہ ہوگا کہ مسئلہ ناسخ و منسوخ کو جو کچھ تھوڑی سی تقویت اس ظاہری تعارض سے ملتی ہے جو دراصل غلطی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے وہ بھی دور ہوجائیگی۔

اس جگہ سب سے پہلے ہم انہیں آیات پر بحث کرینگے جو حدیث مندرجہ بالا میں مذکور ہیں۔ ان میں سب سے پہلی آیت کے متعلق تو ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے کہ ابن عباس اسکے منسوخ ہونیکے اعتقاد کا مخالف تھا۔ بلکہ اس نے ثابت کردکھایا کہ اسکے اصل معنے کسی آیت قرآنی کے معنوں کے مخالف اور معارض نہیں پڑتے اور اسلامی دنیا کا تعامل بھی انہی

معنوں کی سچائی پر شہادت دیتا ہے۔ دوسری حدیث میں بھی حضرت ابن عمرؓ کا قول ہی بیان کیا گیا ہے کہ سورۃ البقرہ کی آیت وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ آیت لایکلف اللہ نفسًا الا وسعھا الخ سے منسوخ ہوگئی ہے۔ اب کوئی شخص ان دونوں آیات کے ٹھیٹھ لفظی ترجموں کو ہی دیکھے اور سمجھے تو اُس پر عیاں ہوجائیگا کہ یہ دونوں آیات ہرگز ہرگز ایک دوسری کے متضاد اور مخالف نہیں اور اس لیے انہیں سے کوئی آیت دوسری آیت کو منسوخ نہیں کرتی۔ ہاں اگر لفظ منسوخ کے کوئی اور معنے لیے جائیں جو اسکے عام اور مشہور مفہوم سے جدا ہیں تو پھر انہیں سے کسی کو کسی کا ناسخ اور منسوخ قرار دینا یا کہنا شاید کسی ایسی اصطلاح کی رو سے بجا ہو۔ پہلی آیت کا ترجمہ تو یہ ہے "جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ اور اگر تم کھولو گے اپنے جی کی بات یا چھپاؤ گے حساب لے گا تم سے اللہ اور پھر بخشے گا جسکو چاہے اور عذاب کریگا جسکو چاہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ دوسری آیت کا ترجمہ یہ ہے "اللہ بوجھ نہیں ڈالتا کسی شخص پر مگر اسکی طاقت کے مطابق۔ اسی کو ملتا ہے جو کمایا اور اسی پر جو کیا۔ اے رب ہمارے نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھول لیں یا چوکیں۔ اے رب ہمارے اور نہ رکھ ہم پر بوجھ بھاری جیسا رکھا تھا ہم سے اگلوں پر۔ اے رب ہمارے اور نہ اٹھوا ہم سے جسکی طاقت نہیں ہم کو۔ اور درگذر کر ہم سے اور بخش ہم کو اور رحم کر ہم پر۔ تو ہمارا صاحب ہے۔ تو مدد کر ہماری قوم کافر پر"۔ ان دونوں آیتوں میں پہلی آیت میں وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ اور دوسری میں لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعھا کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ یہ آپسمیں متضاد ہیں اور ایک دوسری کے مفہوم سے معارض اور مخالف مفہوم رکھتی ہیں۔ لیکن یہ ان لوگوں کی سمجھ کی غلطی ہے۔ یہ دونوں مضمون ہرگز ایک دوسرے سے معارض نہیں پڑتے۔ صراحتًا تو کیا کنایتًا بھی انمیں تضاد ثابت نہیں ہوسکتا۔ نسیان اور فراموشی انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ پس نسیان کی وجہ سے خطاؤں اور قصوروں کا اس سے سرزد ہونا ایک معمولی امر ہے۔ پھر اگر انسان فطرتی نسیان کی وجہ سے کوئی قصور کر بیٹھے جسکے کرنیکے لیے اسکے عمد اور نیت کو ہرگز دخل نہ ہو تو ایسی حالت میں انسان کو یہ دعا تعلیم کی گئی ہے ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطأنا ان دعائیہ الفاظ سے پہلے ہی یہ الفاظ آئے ہیں لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعھا اور ماحصل ان الفاظ کا صاف ظاہر ہے یعنی ایسے امور جو انسان کی طاقت سے باہر ہیں خدا انکے بجالانیکا حکم کسی کو نہیں دیتا جیساکہ نسیان سے اگر کوئی خطا ہوجائے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ ہی دعا تعلیم کرتا ہے کہ اے خدا تو ایسی خطائیں بھی معاف کر۔ خود خدائے تعالیٰ کا انسان کو یہ دعا سکھانا صاف بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی خطاؤں کو قابل درگذر سمجھتا ہے اور ان پر مواخذہ نہیں کرتا یہی تشریح لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعھا کی ہے۔ پھر دوسری آیت ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا انسان کو علم دینا ہے کہ انسان کے اندرونی حالات

اور ارادے سے خدا تعالیٰ ہر وقت واقف اور عالم ہے۔ انسان دل ہی دل میں سخت سے سخت گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ لیکن کوئی گناہ اس سے مخفی نہیں رہتا وہ خدا جو دلوں کی مخفی باتوں کو جانتا ہے ایسے گناہوں کو بھی سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑیگا جو انسان پوشیدہ طور سے کرتا ہے۔ اب ناظرین خود ہی غور کر سکتے ہیں کہ ان دونوں آیتوں کے مضامین میں ذرہ بھر تعارض نہیں۔ ایک آیت تو ایسے گناہوں کا حال اور انکا علاج بیان کرتی ہے جو محض انسان کے فطرتی نسیان اور فراموش کاری کی وجہ سے اس سے بے ساختہ اور بے ارادہ واقع ہوگئے ہوں اور دوسری آیت میں اُن گناہوں کا ذکر ہے جو انسان مخفی طور پر دل ہی دل میں کرتا ہے اور انکے کرنے میں اسکے عمد اور ارادہ کا دخل ہوتا ہے۔ ان دونوں آیتوں میں سے کسی ایک کو منسوخ سمجھنا سراسر غلطی ہے۔ یہ دونوں ایسی ضروری آیتیں ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کا نہ ہونا بہت سے ضروری معارف سے محروم کر دینے کا موجب ہوتا ہے۔ اگر آیت ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ کو منسوخ مانا جائے تو بہت ساری آیات کے سمجھنے میں لاینحل دقتیں پیش آتی ہیں۔ مثلاً ریاکاری ایک ایسا گناہ ہے کہ جو دل ہی دل میں چھپا ہوتا ہے مگر یہ ایک مکروہ گناہ ہے اور سزا کا مستوجب بناتا ہے۔ اگر یہ آیت منسوخ سمجھی جاوے تو پھر ریاکاری کے لیے یا ایسے گناہوں کے لیے جو دل ہی دل میں مخفی طور پر سرزد ہوتے ہیں جیسے نفاق کبر وغیرہ گویا کوئی سزا نہیں ہونی چاہیئے حالانکہ دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑے بھاری گناہ ہیں۔ پھر الفاظ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا جن کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ کو منسوخ کرتے ہیں۔ انمیں وہ معنے موجود ہی نہیں جو قائلان ناسخ و منسوخ خیال کرتے ہیں۔ یہ آیت صرف اسی جگہ قرآن شریف میں نہیں آئی بلکہ اس کے قریب قریب ہم معنے الفاظ میں اس سے بہت پہلے کئی آیات مکہ میں نازل ہوئیں۔ چنانچہ تین مکی سورتوں میں تین مقامات پر یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ سورۃ الانعام (پارہ ۸) ع ۱۸ میں لا نکلف نفساً الا وسعھا ایسا ہی سورۃ الاعراف ع ۵ میں لا نکلف نفساً الا وسعھا اور پھر اسی طرح سورۃ المؤمنون ع ۴ میں یہی الفاظ موجود ہیں۔ اور یہ تینوں سورتیں مکی ہیں۔ اب جس صورت میں یہ آیت مکہ میں نازل ہو چکی تھی اور اسکا تعارض آیت ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ سے بیان کیا جاتا ہے۔ تو پھر یوں کہنا چاہیئے کہ ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ نے لا نکلف نفساً الا وسعھا کو منسوخ کیا نہ کہ بر عکس کیونکہ پہلے کی آیت لا نکلف نفساً الا وسعھا ہے پھر جب آیت ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ نے آیت لا نکلف نفساً الا وسعھا کو منسوخ کر دیا تو اس منسوخ شدہ آیت کی ہم معنے آیت لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا پھر نازل ہوئی اور آیت ناسخ ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ کو منسوخ کیا۔ کیا کوئی سمجھدار آدمی ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو قبول کر سکتا ہے؟ پس معلوم ہوا کہ ان دونوں آیتوں کے معنوں میں تعارض کوئی

نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی فوز الکبیر میں لکھا ہے کہ اس آیت کو منسوخ نہیں سمجھا جا سکتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ حقیقت میں یہ عام کو خاص کرنیکی ایک صورت ہے۔ بیشک دوسری آیت اس بات کی تشریح کرتی ہے کہ مافی انفسکم سے مراد حدیث النفس نہیں بلکہ اس سے مراد صحت نیت۔ خلوص یا ریاکاری ہے۔ حدیث النفس ایک ایسی چیز ہے کہ اسپر انسان کو کچھ قدرت نہیں ہوتی اور اس کے قصد کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ انسان پر کوئی بوجھ ایسا نہیں ڈالتا جس کے تحمل کی وہ طاقت نہیں رکھتا۔ ایسا ہی اس آیت کے امام رازی نے بھی یہی معنے کیے ہیں اور اس کے منسوخ نہ ہونیکی تائید میں بہت ساری دلایل لکھی ہیں۔ اور ثابت کیا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں۔ صاحب فتح الباری فی شرح صحیح بخاری نے اس حدیث کی شرح میں ایک یہ پہلو بھی لکھا ہے کہ "اس حدیث میں نسخ کے معنے وہی لیے جا سکتے ہیں جو متقدمین کے نزدیک مختار اور مستعمل تھے۔ اور ان متقدمین کے نزدیک نسخ کے معنے عموم کو مختص کرنا ہے"۔ پس اس بات کے ملنے کے لیے کہ یہ آیت منسوخ نہیں بہت دلایل قویہ موجود ہیں۔ ایسی آیت کو منسوخ خیال کرنا ہی بڑی غلطی ہے۔ لفظ نسخ کے ان معنوں کے لحاظ سے اس حدیث کے یہ معنے ہونگے کہ پہلی آیت میں جو حکم درج ہوا ہے وہ عام ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ہر ایک جو کچھ دل میں مخفی رکھکر کرتا ہے یا اسکو علانیہ کرتا ہے ان سب کا محاسبہ ہوگا۔ لیکن دوسری آیت کے نزول سے اس عمومیت میں یہ تخصیص پیدا کی گئی کہ جو خطا ایسے طور سے سرزد ہو کہ جس میں انسان کے ارادہ اور نیت کو دخل نہ ہو وہ قابل مواخذہ اور سزا نہیں۔

تیسری حدیث میں یہ ذکر ہے کہ حضرت ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ پہلے پہل اسلام میں ایسا ہوتا تھا کہ متوفی کا ترکہ صرف اس کے لڑکوں کو ملتا تھا اور متوفی کے والدین کا اس میں کوئی حق نہیں رکھا گیا تھا۔ البتہ والدین اس صورت میں کچھ حصہ ترکہ متوفی حاصل کر سکتے تھے جب متوفی انکے حق میں کوئی وصیت اس بارہ میں کر جاتا تھا۔ لیکن اس رواج کا ایک حصہ سورۃ النسا کی اس آیت سے منسوخ ہو گیا جس میں ورثا رکے مفروض اور معین حصص مقرر کیے گئے ہیں۔ اس حدیث کے اپنے الفاظ صاف طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ یہاں ایک رواج کا ذکر ہے جو ایام جاہلیت میں اس ملک میں مروج تھا۔ جاہلیت کے زمانہ میں ملک عرب کا رواج تھا کہ متوفی کے ترکہ کی صرف اولاد نرینہ ہی وارث اور حقدار ہوتی تھی لڑکیوں کو اور دیگر وارثوں کو کوئی حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ عربوں کا خیال تھا کہ ترکہ کے حقدار وہی لوگ ہوتے ہیں جو قوم کی طرف سے جنگ میں جائیں جیسا کہ فتح الباری میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر جب خدا کے فضل سے آفتاب اسلام طلوع ہوا تو اس نے مروجہ رسوم کو دفعتاً جڑھ سے نہ اکھاڑا۔ بلکہ نہایت حکیمانہ طور سے بڑے تحمل کے ساتھ ایک ایک پرانی رسم و رواج کو چنا مگر تدریج اور سہولت اور حکمت کے ساتھ۔ اس میں کلام نہیں کہ اس تدریجی نزول احکام کے سبب سے مسلمانوں کی یہ

حالت تھی کہ جب تک کوئی حکم کسی امر کے متعلق نازل نہ ہوتا تھا اسوقت تک وہ لوگ صرف ان قدیم جاہلیت کے رسوم ورواج پر عمل کرتے رہتے۔ اسی طرح ورثہ کے متعلق بھی جب تک کہ قرآن شریف میں سورۃ النساء کے مندرجہ احکام نازل ہوکر ان قدیم مستعملات کی اصلاح کا موجب نہ ہوئے اُسوقت تک پرانی رسموں کے مطابق ہی وراثت تقسیم کرتے تھے۔ پھر جب خدا تعالیٰ کی طرف سے احکام جاری ہوگئے تو انہوں نے فی الفور پرانی رسوم کو چھوڑ کر خدا کے حکموں پر عمل شروع کردیا۔ جب وہ آیات نازل ہوئیں جن میں عورتوں کے لیے بھی ترکہ میں حصے رکھے گئے ہیں اور لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے ساتھ ترکہ والدین کا حقدار بنایا گیا ہے (للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منہ او کثر) تو آنحضرت صلعم نے ان آیتوں کو بھی حسب دستور صحابیوں کو سنایا۔ یہ حکم سنتے ہی بعض صحابیوں نے تعجب اور حیرت کے مارے آنحضرت صلعم سے سوال کیا۔ "کیا ہم پر واجب کیا گیا ہے کہ اب اس چھوٹی لڑکی کو بھی ترکہ میں حصہ دیا کریں جو گھوڑے پر سوار ہونا اور دشمن کو ہزیمت دینا نہیں جانتی" (فتح الباری) یہ امر واقعی ہے کہ عربوں میں قدیم قانون یہی تھا کہ لڑکیوں اور عورتوں کو ترکہ میں سے حصہ نہ ملے۔ اور یہی وہ قانون ہے جس کے منسوخ ہونیکی طرف ابن عباس نے حدیث محولہ بالا میں اشارہ کیا ہے۔ ابن عباس نے کسی آیت قرآنی کا نہ تو یہاں اس سے معارض ہونیکا ذکر ہی کیا ہے اور نہ ہی کسی طرح سے اس کے اس بیان سے کسی آیت قرآنی کے منسوخ ہونیکا مذکور ثابت ہوتا ہے۔ پس یہاں منسوخ سے مراد کوئی قرآنی آیت نہیں۔ بلکہ اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ لفظ نسخ صحابہؓ وسیع معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح پانچویں حدیث جس کا اوپر ذکر آیا ہے اسکا راوی بھی ابن عباس ہی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جب مہاجرین مدینہ میں قرار گزین ہوئے۔ تو آنحضرت صلعم نے انہیں اور انصار میں بعض کا بعض کے ساتھ بھائی بندی کا رشتہ بنا دیا۔ اور اس رشتہ اخوت کی بنا پر مہاجر اپنے متوفی بھائی انصاری کا ترکہ پاتا تھا۔ لیکن جب آیت ولکلٍ جعلنا موالی (یعنی ہر ایک کے لیے ہم نے ولی بنا دیئے ہیں) نازل ہوئی تو اسوقت یہ دستور جو ترکہ کے متعلق مروج تھا منسوخ ہوگیا۔ اسجگہ بھی کسی قرآنی آیت کے منسوخ ہونیکا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسا دستور منسوخ ہوا ہے جو کسی قرآنی آیت کی بنا پر مروج نہ تھا۔ جب آنحضرت صلعم ہجرت کرکے مدینہ شریف پہنچے اور صحابہؓ کی جماعت آپکے ہمراہ تھی۔ تو آپنے مدینہ کے مسلمان باشندوں میں سے ہر ایک کو جنہیں انصار کہتے ہیں حکم دیا کہ وہ ایک ایک مہاجر کو اپنا بھائی بنالیں۔ چنانچہ اس کے مطابق ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری میں برادری کا پیوند قائم ہوگیا۔ اور یہ رشتہ اخوت ایسا مؤثر اور مضبوط ہوتا گیا کہ اسکا تعلق ترکہ تک بھی پہنچ گیا۔ گویا یہ رشتہ حقیقی برادری کا ہوگیا۔ یہانتک کہ ایک بھائی کی وفات کے بعد دوسرا بھائی حقیقی بھائی کی طرح اس کے ترکہ کا وارث قرار پاتا۔ یہ کوئی اسلامی رسم نہ تھی بلکہ اس کی بنا عرب کی قدیم رسوم تعلق داری پر تھی۔ کیونکہ عربوں میں یہ رسم تھی کہ دو غیر شخص جب

آپسمیں بھائی بنجاتے تو وہ ایسا گہرا تعلق ہو جاتا کہ ایک دوسرے کا وارث جائز سمجھا جاتا اور اسکے مرنے پر اسکے ترکہ کا حقیقی بھائی کی طرح حقدار ہوتا۔ اسی رسم کو اس تعلق برادری میں داخل کر دیا گیا جو انصار اور مہاجرین کے درمیان قایم کیا گیا۔ چنانچہ ایک عرصہ تک مسلمان اسپر عمل کرتے رہے۔ لیکن اس کے بعد یہ رواج قرآن شریف کی آیت سے منسوخ قرار دیا گیا۔ جس کا ذکر اس حدیث میں ہے۔ اور وہ آیت یہ ہے ولکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم۔ ان اللہ علی کل شیٔ قدیر۔ یعنی ہر ایک آدمی کے جو کچھ والدین اور اقربا ترکہ چھوڑ مریں اس کے لیے ہم نے وارث مقرر کر دیئے ہیں۔ اور جن کے ساتھ تم نے اپنے دائیں ہاتھ بڑھا کر بھائی چارہ گانٹھا ہے انکو انکا حصہ دو۔ خدا ہر شے پر بڑی قدرت رکھنے والا ہے۔" یہ سورۃ النسار کی آیت ہے جو پانچویں سیپارہ میں درج ہے۔ فاتوھم نصیبھم کی تشریح میں حدیث میں لکھا ہے والذین عقدت ایمانکم من النصر والرفادۃ والنصیحۃ وقد ذھب المیراث ویوصی لہ۔ "اور ان لوگوں کو جن کے ساتھ اخوت کا معاہدہ کیا تھا . . . . مدد اور تحائف اور نصیحت ہے۔ انکو ترکہ نہیں پہنچتا مگر انکے حق میں وصیت کیجا سکتی ہے۔" غرض اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی قرآنی آیت اس آیت کے نزول سے منسوخ ہو گئی تھی۔ بلکہ ایک ایسی رسم منسوخ ہو گئی تھی جسکو مسلمانوں نے اقتضائے ضرورت وقت کے لیے بصورت عدم وجود گی حکم قرآن شریف بطور مستعار عربوں کی قدیم رسوم سے لیا ہوا تھا۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے کہ جس کے لیے قرآن شریف کا وجود مانا گیا ہے۔ کیونکہ قدیم رسوم کی اصلاح کرنا اور صحیح اور معتدل اصول اور قوانین کا پیش کرنا ہی قرآنی مشن تھا۔

اب ہم چوتھی حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ ذرہ پیچیدہ سی حدیث ہے۔ سورۃ النساء رکوع ۳۰ میں یہ آیت ہے والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھر وعشرا۔ فاذا بلغن اجلھن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن بالمعروف۔ واللہ بما تعملون خبیر۔ "تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیوائیں چھوڑ مریں انہیں چاہیئے کہ چار مہینے اور دس دن صبر کریں۔ اور جب یہ میعاد پوری ہو چکے تو جس طرح جائز طور پر وہ اپنے نفوس سے برتاؤ کریں تم اسکے جواب دہ نہ ہو گے جو کچھ تم کرتے ہو خدا کو اسکی پوری خبر رہتی ہے۔" پھر آگے چلکر اسی سورۃ میں یہ آیت ہے والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا وصیۃ لازواجھم متاعا الی الحول غیر اخراج فان خرجن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن من معروف واللہ عزیز حکیم "اور تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور بیوائیں چھوڑ مریں ان بیواؤں کے گذارہ کے لیے ایک سال بھر کا گذارہ اور گھر سے نہ نکالا جانا وصیت ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی مرضی سے نکل جائیں تو جو کچھ مناسب اور بہتر طور سے وہ اپنے نفوس کیلیے کریں تو اس کا تمہاری گردن پر کوئی الزام اور مواخذہ نہیں۔ خدا غالب حکمت والا ہے۔" پھر انکے سوا سورۃ النسار رکوع ۱۳ میں آیت

ہر ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد۔ فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترکتم من بعد وصیة توصون بھا او دین۔ یعنی اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو تمہارے ترکہ میں تمہاری بیواؤں کا چوتھا حصہ ہے اور اگر تمہاری اولاد ہے تو تمہارے ترکہ میں سے ان کا آٹھواں حصہ ہے لیکن یہ حصے تمہاری وصیت اور قرضے کے ادا ہو جانیکے بعد ہونگے۔" یہ آیت ہے جس میں عورت کا مرد کے ترکہ میں سے حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ اب بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تینوں آیات ایک دوسرے کی معارض ہیں۔ اور ان کے نزدیک ان آیات کے بعض احکام ایک دوسرے کے مقابل میں منسوخ ہیں۔ اب ہم اسجگہ اُس حدیث کی طرف توجہ کرتے ہیں جو صحیح بخاری میں وارد ہے۔ اور اسپر تفصیل سے نظر ڈالتے ہیں۔ سب سے پہلے تو مجاہد کی روایت آتی ہے۔ مجاہد حضرت ابن عباس کے مشہور شاگرد ہیں۔ وہ پہلی آیت والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعة اشھر وعشرا۔ کی تفسیر کے بیان میں کہتے ہیں کہ "چار ماہ دس دن کی میعاد ضروری تھی اور اسپر عمل کرنا بھی ضروری تھا۔ اسکے بعد خدا تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا وصیة لازواجھم متاعا الی الحول الخ اسطرح اللہ تعالیٰ نے سات ماہ اور بیس دنوں کی میعاد بیوہ عورت کیلیے ... بڑھا کر اسکو پورا سال کردیا۔ اور اسکو اختیار دیا کہ اگر وہ چاہے تو ایک سال بھر اسی خاوند کے گھر میں وصیت کے مطابق رہے اور اگر چاہے تو گھر چھوڑ جائے۔ یہ بات آیت کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ اسکو مجبوراً گھر سے نہ نکالا جاوے لیکن اگر وہ اپنی مرضی سے خود چھوڑ کر چلی جاوے تو وارثوں پر کوئی الزام نہیں مگر عدت یعنی چار ماہ اور دس دن کا انتظار بہرحال ضروری ہوگا۔" یہ مجاہد کی رائے تھی اور انکا خیال تھا کہ ان دونوں آیتوں میں سے نہ کوئی کسی کی ناسخ ہے اور نہ منسوخ۔ اب حضرت ابن عباس کے ایک اور مشہور شاگرد ہیں جن کا نام عطا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "ابن عباس کی یہ رائے تھی کہ آیت والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا وصیة لازواجھم متاعا الی الحول غیر اخراج الخ کے نزول سے وہ آیت جس میں بیوہ کے لیے چار ماہ دس دن کی عدت مقرر ہے منسوخ ہو گئی ہے۔" پھر آگے چلکر وہ کہتے ہیں متاعا الی الحول غیر اخراج سے مراد یہ ہے کہ بیوہ عورت کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی عدت کے ایام ان دونوں طریقوں سے جس طریق پر چاہے شمار کرے۔ یعنی اگر وہ چاہے تو اپنے ایام عدت ایک سال شمار کرے اور سال بھر متوفی خاوند کے گھر میں رہے اور وہیں سے اپنی مرضی کے موافق ضروریات زندگی لیتی رہے۔ اور اگر وہ پسند کرے تو خاوند متوفی کے گھر سے اس مدت سے پہلے کسیوقت چلی جاوے۔ اسی لیے خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس بات کا تمپر کوئی الزام نہیں کہ جسطرح وہ چاہیں اپنے نفوس کے ساتھ معروف طریق پر برتاؤ کریں۔ اس کے بعد ورثہ اور ترکہ کی آیات نازل ہوئیں۔ انکے نزول سے سال بھر کے گذارہ اور خاوند کے گھر رہنے کا حکم منسوخ ہو گیا۔ اور یہ اختیار رہا کہ وہ اپنی عدت کے

دونوں کو جس طرح چاہے شمار کرے لیکن اسکو گذارہ لینے کا کوئی حق نہیں۔" عطا کی رائے کچھ ایسی مبہم سی ہے کہ اسپر حصر کرنا نہایت مشکل ہے۔ درحقیقت ان آیات میں کوئی ناسخ و منسوخ نہیں۔ ایسا کہنا صرف انکے معنوں کی غلط فہمی ہے۔ پہلی آیت میں اس مدت کا ذکر کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیواؤں کے لیے انکے خاوندوں کے مرنیکے بعد شادی سے رُکے رہنے کے لیے مقرر کی ہے۔ اس زمانہ کا نام اصطلاح شرعی میں عدت ہے۔ اور مراد اس عدت سے یہ ہے کہ کوئی بیوہ اپنے خاوند کی وفات سے چار ماہ دس دن کے اندر کسی دوسرے سے شادی کرنیکا حق نہیں رکھتی۔ قرآن شریف میں عدت کے تغیر و تبدل کے لیے کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ جس سے اس آیت کو منسوخ سمجھا جاسکے۔ البتہ سورۃ الطلاق میں اُن عورتوں کے لیے جو حاملہ ہوں بجائے اس عدت کے یہ حکم ہے کہ جبتک بچہ پیدا نہ ہوجائے اُسوقت تک وہ کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کریں۔ لیکن اس بات کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ یہ حکم عدت کے حکم کی ترمیم اور تنسیخ نہیں۔ بلکہ یہ علیحدہ صورت ہے اور اس لیے علیحدہ حکم ہے۔ پھر وہ آیت جس میں خاوند کی وصیت کے موافق ایک سال تک خاوند کے گھر میں بیوہ کے رہنے کی اجازت کا ذکر ہے وہ بھی عدت کی آیت کو منسوخ نہیں کرتی۔ کیونکہ عدت کی غرض تو یہ ہے کہ اس میں بیوہ عورت کے لیے خاوند کے مرجانیکے بعد ایک مقررہ مدت تک کسی دوسرے شخص سے شادی کرنیکی اجازت نہیں ہوتی۔ گویا اس میعاد کے اندر شادی جائز ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر یہ عدت ترمیم ہوتی تو ایسا ہونا چاہیئے تھا کہ بجائے چار ماہ دس دن کے کوئی اور کم یا بیش میعاد مقرر کیجاتی اور اس میعاد کا بھی نام رکھا جاتا اور اس میں بیوہ عورت کو کسی مرد سے نکاح کرنیکی اجازت نہ ہوتی۔ لیکن سال کی میعاد جو دوسری آیت میں ہے وہ ان اغراض کے لیے نہیں کہ بیوہ عورت کو بجائے چار ماہ دس ایام کے ایک سال بھر کسی سے نکاح نہیں کرنا چاہیئے۔ ایسا تو ہرگز اس آیت سے ظاہر نہیں ہوتا۔ ماسوائے اس کے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ یہ آیت اس آیت سے پہلے نازل ہوئی تھی پھر جبکہ یہ آیت ہی پیچھے نازل ہوئی تو کیونکر مانا جاسکتا ہے کہ ایک ایسی آیت جو پہلے نازل ہوچکی تھی وہ بعد میں نازل ہونیوالی آیت کو منسوخ کرے۔ یہ کیسی ناممکن اور خلاف قیاس بات ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ سورۃ النساء میں جو حق ترکہ بیوہ کے لیے رکھا گیا ہے کیا اس کے نزول سے ایک سال کے گذارہ کی وصیت والی آیت منسوخ ہوگئی ہے؟ ان دونوں آیتوں میں رشتہ ناسخ و منسوخ قائم کرنیکا خیال بھی از خود تراشیدہ ہے۔ سارے قرآن شریف میں کہیں اس بات کا بطور اشارہ بھی ذکر نہیں اور نہ ہی کسی حدیث نبوی میں کوئی اشارہ اس قسم کا کہیں آیا ہے۔ اور اس خیال کے حامی ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کرسکتے کہ کبھی کوئی مقدمہ اس قسم کا آنحضرت صلعم کے حضور میں پیش ہوا ہو جس میں آپ نے صراحت یا کنایت سے ہی ایسا فیصلہ کردیا ہو کہ بیوہ عورت کے لیے جو ایک سال بھر خاوند متوفی کے مکان میں رہنے اور گذارہ

لینے کی وصیت کے نیچے اجازت تھی وہ اسوقت تک تھی جب تک کہ اس کے لیے ترکہ خاوند متوفی میں سے بصورت موجودگی اولاد آٹھواں اور بصورت عدم موجودگی اولاد چوتھا حصہ پانیکا حکم نازل نہ ہوا تھا۔ پھر جب یہ حکم نازل ہوا تو وہ حق منسوخ ہوگیا۔ بلکہ برخلاف اس کے قرآن شریف میں یہ حکم صریح ہے کہ بیوہ عورت کو ترکۂ خاوند متوفی سے حصہ دینے سے پہلے متوفی کی وصیت اور قرضے ادا کردینے ضروری ہیں۔ اور جو کچھ وصیت اور قرضہ سے بچے وہ ورثاء میں تقسیم ہو۔ ان باتوں کے سوا ایک اور واضح قرینہ ایسا موجود ہے کہ جس سے صاف طور پر عیاں ہوتا ہے کہ بیوہ کے لیے خاوند متوفی کے گھر میں سال بھر رہنا اور گذارہ لینا جو وصیت کے ماتحت رکھا گیا ہے منسوخ نہیں ہوا۔ شریعت اسلام نے اصولی طور پر عورتوں کے لیے حقوق میں بہت نرمی رکھی ہوئی ہے۔ جہاں کہیں قرآن شریف میں عورتوں کے ساتھ برتاؤ اور ان کے حقوق کی ادائیگی اور نگہداشت کا حکم دیا ہے وہاں ضرور دیکھا جائیگا کہ اس قسم کی تاکید ہے کہ انکے ساتھ ایسی نرمی سے برتاؤ کیا جائے کہ ان کے حقوق سے کچھ زیادہ ہی سلوک انسے کیا جائے۔ یہ غور کا مقام ہے کہ اس آیت کے ساتھ ہی جس میں بیوہ عورت کو خاوند متوفی کی وفات کے بعد اس کے گھر میں ایک سال رہنے اور گذارہ لینے کی وصیت کی اجازت دی گئی ہے ایک اور آیت بالکل ساتھ ملی ہوئی ہے جس میں اسی قسم کا حق مطلقہ عورت کے لیے رکھا گیا ہے چنانچہ یہ دونوں آیتیں اسطرح پر ہیں والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا وصیة لازواجھم متاعا الی الحول غیر اخراج۔ فان خرجن فلا جناح علیکم فی ما فعلن فی انفسھن من معروف۔ واللہ عزیز حکیم۔ وللمطلقت متاع بالمعروف حقا علی المتقین۔ ترجمہ۔ جو لوگ تم میں سے فوت ہوجائیں اور بیوائیں چھوڑ مریں انہیں چاہیئے کہ اپنی بیواؤں کے لیے وصیت کرسکتے ہیں کہ ایک سال تک ان کے لیے اسی گھر سے کھانے پینے کے خرچ دیئے جائیں اور ان کو وہاں سے نکالا نہ جائے۔ ہاں اگر وہ اپنی مرضی سے نکل جائیں تو تم پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں کہ جو چاہیں وہ مناسب طور پر اپنے آپ سے سلوک کریں۔ اللہ تمام عزتوں اور حکمتوں کا مالک ہے۔ اور مطلقہ عورتوں کے لیے بھی مناسب طور پر کھانے پینے کا خرچ دیا جائے۔ یہ متقیوں پر ایک حق ہے۔

ان دونوں موقعوں پر لفظ متاع استعمال ہوا ہے۔ جس کے لفظی معنے ہیں۔ کوئی مفید شئے یا ضروریات زندگی لین کی مشہور و معروف لغت میں لکھا ہے کہ متاع جب مطلقہ عورت کے لیے مستعمل ہوتا ہے تو اسکے معنے ضروریات زندگی مثل غذا۔ لباس۔ اثاث البیت وغیرہ ہوتے ہیں۔ اب جس طریق پر مطلقہ عورت کے لیے حق مہر کے علاوہ معقول متاع کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح بیوہ عورت کے لیے مہر اور حصہ ترکہ معینہ کے علاوہ یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ اسکو سال بھر تک گذارہ اور رہایش خاوند متوفی کے گھر میں دی جاوے۔ یہ قیاس درست

نہیں کہ آیت ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد۔ فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترکتم من بعد وصیۃ توصون بھا او دین۔ (اور لے مردو! اگر تمہارے ہاں اولاد نہیں تو تمہارے ترکہ میں سے تمہاری بیواؤں کو چوتھا حصّہ ملے۔ لیکن اگر تمہاری اولاد ہو تو تمہاری بیواؤں کیلیے تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصّہ مقرر ہے جو تمہاری وصیتوں اور قرضہ کے ادا کرنیکے بعد دیا جاوے) کے نازل ہونیسے آیت والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجًا۔ وصیۃ لازواجھم۔ متاعًا الی الحول غیر اخراج الخ گویا منسوخ ہوچکی ہے۔ اور یہ خیال ایسا ہی بے بنیاد ہے جیسا کہ کوئی یہ خیال کرلے کہ گویا وہ آیت جس میں مطلقہ عورت کو حق مہر ادا کرنیکا حکم ہے اس کے نزول سے آیت متاع بالمعروف منسوخ ہوگئی ہے۔ مطلقہ عورت کو اپنے خاوند کی جائداد پر سوائے اپنے حق مہر کے اور کسی چیز کا حق نہیں لیکن باوجود اس بات کے پھر بھی شریعت اسلام میں اسکی بہت رعایت کیگئی ہے اور متاع بالمعروف کی سفارش کی گئی ہے۔ اسی طرح بیوہ عورت کا اپنے متوفی خاوند کی جائداد پر مقررہ آٹھویں یا چوتھے حصّہ سے بڑھکر کوئی حق نہیں۔ لیکن باوجود اس بات کے خاوند کو یہ سفارش کی گئی ہے۔ کہ وہ اپنی بیوی کے حق میں وصیت کرچھوڑے۔ کہ میرے مرنیکے بعد ایک سال تک اُسے میرے گھر میں بود و باش رکھنے سے روکا نہ جاوے اور اُسکی ضروریات زندگی بہم پہنچائی جائیں۔ یہ دونوں حالات ایک ہی سطح پر مساوی ہیں۔ مطلقہ عورت کو حق مہر اور اس کے ساتھ متاع بالمعروف لینے کا حق دیا گیا ہے۔ اور بیوہ کو حق مہر متوفی خاوند کے ترکہ میں سے شرعی حصّہ اور ایک سال کی رہایش اور خورونوش (متاع الی الحول غیر اخراج) کا حق دیا گیا ہے۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں متاع بالمعروف اور متاع الی الحول غیر اخراج خاوند کی مرضی اور اختیار پر چھوڑے گئے ہیں۔

ایسا ہی ایک اور حدیث انہی آیتوں کے متعلق ہے۔ جو مسئلہ نسخ اور حفاظت قرآن پر اچھی طرح روشنی ڈالتی ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاری میں ابن زبیر کی روایت سے درج ہے جس کے الفاظ یہ ہیں قال ابن الزبیر قلت لعثمان بن عفان والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجًا قال قد نسختھا الایۃ الاخریٰ فلم تکتبھا او تدعھا قال یا ابن اخی لا اغیر شیئًا منہ من مکانہ جسکا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ "ابن زبیر سے روایت ہے کہ کہا اُس نے کہ میں نے حضرت عثمانؓ کو کہا کہ آیت والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجًا ایک دوسری آیت سے منسوخ ہوچکی ہے تو پھر آپنے اسکو قرآن میں کیوں لکھا ہے؟ اسپر حضرت عثمانؓ نے جواب میں کہا کہ اے میرے بھائی کے بیٹے! میں کوئی چیز جو قرآن میں آئی ہے بدلنے کا حق نہیں رکھتا"۔ اب یہ دونوں آیتیں جنپر ہم بحث کررہے ہیں۔ والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجًا سے ہی شروع ہوتی ہیں۔ لیکن اس حدیث میں کہیں کوئی اشارہ اس امر کے متعلق نہیں پایا جاتا کہ ان دونوں

میں سے کونسی آیت کے منسوخ ہونیکی طرف ابن زبیر کا اشارہ تھا۔ البتہ امام بخاری نے اِس قسم کا اشارہ دیا ہے کیونکہ انہوں نے یہ آیت اِس مضمون کے سر پر بطور سُرخی لکھی ہے اور اسی پر باب باندھا ہے والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعة اشھر و عشرا فاذا بلغن اجلھن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن بالمعروف و اللہ بما تعملون خبیر اب جس حال میں امام بخاری رح نے اس آیت کا یہ پتہ لکھا ہے اور اسپر آجتک کسی قسم کا کسی نے اختلاف نہیں کیا تو جب تک کہ اختلاف ثابت نہ ہو اُسوقت تک ہم کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس حدیث سے کوئی اور آیت مشاراً الیہ سمجھیں۔ یہاں یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ ابن زبیر کے نزدیک آیت مذکورہ بالا جس میں چار ماہ اور دس دنوں کی عدت بیوہ عورتوں کے لیے خاوندوں کے مرنیکے بعد نکاح سے رکے رہنے کے لیے مقرر کیگئی ہے وہ اس دوسری آیت سے جس میں متاع الی الحول غیر اخراج آیا ہے منسوخ ہو چکی ہے۔ دراصل ابن زبیر نے اس آیت کے معنے سمجھنے میں غلطی کھائی ہے اور یہ سمجھا ہے کہ اس سے بجائے چار ماہ اور دس دن ایام عدت کے ایک سال کی عدت کر دی گئی ہے۔ لیکن ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں کہ یہ دونوں آیتیں اپنے اپنے جدا مضامین اور مقاصد رکھتی ہیں اور کوئی بھی ان میں ناسخ و منسوخ نہیں ایک میں تو یہ حکم درج ہے کہ جب کسی عورت کا خاوند مر جائے اور وہ بیوہ رہ جائے تو جب تک کہ اُس کے مرنیکے بعد چار ماہ اور دس دن نہ گذر جائیں اُسوقت تک وہ بیوہ عورت کسی سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اور دوسری آیت میں خاوند کو سفارش کی گئی ہے کہ وہ اپنی عورتوں کے حق میں اس مضمون کی وصیت کریں کہ میرے مرنیکے بعد میری بیوہ کو سال بھر تک میرے ہی گھر میں رہنے سے نہ روکا جاوے اور اُسکی ضروریات زندگی اسی جگہ سے دیجاویں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ دونوں آیتیں اپنے اپنے مضامین اور مقاصد جدا جدا رکھتی ہیں ایک میں بعد مرگ خاوند بیوہ عورت کو چار ماہ اور دس دن تک نکاح سے رُکے رہنے کا حکم ہے اور دوسری میں خاوند کو اپنی عورت کے حق میں بعض رعایتوں کی سفارش کی گئی ہے اس لیے ابن زبیر کا یہ خیال کہ یہ آیتیں ایک دوسری کی ناسخ ہیں قابل التفات نہیں۔ اب حضرت عثمانؓ کے جواب کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ ابن زبیر کے جواب میں آپنے فرمایا کہ جو چیز قرآن میں آچکی ہے اسکو میں کسی طرح نہیں بدل سکتا اس سے صاف روشن ہوتا ہے کہ آپکے نزدیک کوئی آیت قرآنی بجز حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منسوخ نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہی کسی غیر شخص کی رائے سے قرآن شریف میں کوئی تبدیلی کیجا سکتی تھی حضرت عثمانؓ نے ابن زبیر کو یہی بات سمجھائی کہ جس چیز کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جزو قرآن قرار دے دیا ہے کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ اُس میں کسی قسم کی تبدیلی کرے۔ آپنے ابن زبیر یا کسی اور کے کہنے یا سمجھنے یا قیاس کرنے پر کہ فلاں آیت قرآن منسوخ ہو چکی ہے اسکو درج قرآن نہیں کرنا چاہیئے بطلق التفات

نہ کیا۔ بلکہ انکو صاف جواب دیا کہ جس کلام کو خدا کا مقدس رسول صلعم قرآن شریف کا جزو ہونا ہم کو بتا گیا ہے ہم اس میں کوئی دست اندازی کر نہیں سکتے۔ حضرت عثمان کے اس بیان سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ قرآن شریف کے بارہ میں وہ کیسے محتاط تھے۔ وہ پاک دل انسان کہتا ہے کہ میں ایک حرف بھی بدل نہیں سکتا۔ پھر وہی سلیم اور محتاط دل حضرت عثمانؓ کا اسوقت بھی تھا جبکہ آپنے قرآن شریف کی نقلیں کرنیکا حکم دیا تھا۔

یہانتک تو ہم نے ان پانچوں حدیثوں پر بحث کی ہے جن کی نسبت بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انکا حکم منسوخ ہے۔ ہم نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ان میں دو حدیثیں تو اس بات کی گواہ ہیں کہ قرآن شریف کی آیت سے عرب کی ایک قدیم اور زمانہ جاہلیت کی رسم منسوخ ہوئی۔ کسی قرآنی آیت کا منسوخ ہونا ان سے کسی طرح ثابت نہیں ہوتا اور دوسری حدیثوں کے متعلق ثابت کیا ہے کہ یا تو لفظ نسخ سے ایک خاص مفہوم یعنی عام کا خاص کرنا مراد ہے اور یا خود اس آیت کے معنوں کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے کہ ایسے معنے اختیار کیے جاتے ہیں جو دوسری آیت کے معارض پڑتے ہیں۔ اور اس وجہ سے ان کے ناسخ یا منسوخ ہونیکا خیال گذرا ہے یہ بات یقینی طور پر ثابت کر دی گئی ہے کہ قائلین ناسخ و منسوخ اپنے اس خیال کی تائید میں آنحضرت صلعم سے ایک لفظ بھی سند میں پیش نہیں کر سکتے صرف مفسرین کی شخصی رائے اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ کوئی آیت قرآن شریف میں ناسخ اور کوئی منسوخ ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ایسے ہرگز نہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ کوئی آیت قرآن شریف کی منسوخ ہے۔ ابن عباس اور ابن عمر اپنی اپنی رائوں کے خود ذمہ وار ہیں۔ اور پھر ان میں آپسمیں ہی اختلاف بھی ہے۔ چنانچہ یہ بات بھی اوپر ہم نے دکھا دی ہے۔ اب ہم اس ایک حدیث کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ جس میں بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ ایک ایسی آیت قرآنی کا ذکر ہے جو منسوخ الحکم اور منسوخ التلاوۃ ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت انسؓ ہیں آپنے جہاں ان ستر قاریوں کا ذکر کیا ہے جن کو کفار نے بئر معونہ پر نہایت بے رحمی سے قتل کیا تھا وہاں یہ الفاظ بھی کہے ہیں۔ "اور ہم انکی نسبت ایک قرآن پڑھتے تھے جو بعد میں اٹھا لیا گیا اور وہ یہ تھا کہ ہماری قوم کو یہ خبر سنا دو کہ تحقیق ہمکو اپنے مولے کے حضور میں بار نصیب ہو گیا ہے۔ اور ہمارا مولے ہم سے خوش ہے اور ہم اس سے خوش" اس مقام پر بعض لوگوں نے لفظ قرآن سے دھوکہ کھایا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ اس سے مراد کوئی قرآنی آیت ہے جس کا حکم اور تلاوت دونوں منسوخ ہو گئے ہیں۔ لیکن ان لوگوں نے قرآن اور القرآن کے معنوں میں جو باریک امتیاز ہے اسکی طرف توجہ نہیں کی اور اس لیے ایک بڑی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ عربی زبان میں قرا پڑھنے کو کہتے ہیں۔ اور قرآن اسی سے مشتق ہے جس کے معنے عام طور پر کسی پڑھنے والی چیز کے ہیں اور جو کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس کا نام القرآن ہے لفظ قرآن اسم نکرہ ہے القرآن

اسم معرفہ ہے جو اُس کتاب مقدس کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی البتہ اس میں شک نہیں ہے کہ چونکہ قرآن کا اکثر استعمال ... کلام الٰہی کے لیے ہی ہوتا تھا دوسرے معنے کے لحاظ سے اس کا استعمال بہت ہی کم ہوگیا۔ اس حدیث مندرجہ بالا میں لفظ قرآن سے القرآن مراد کسی طرح نہیں۔ بلکہ عام طور پر کوئی پڑھنے والی چیز مراد تھی جیسے لغت عرب کا عام محاورہ ہے قرأت الکتاب قرآنا یہاں صرف قرآن کا لفظ واقع ہوا ہے اور القرآن نہیں۔ خود بخاری نے بھی اس لفظ قرآن کو اس حدیث میں القرآن نہیں سمجھا اور اسی لیے انہوں نے اسکو کسی ایسے باب کے ضمن میں بیان نہیں کیا جو خصوصیت سے قرآن شریف کے متعلق باندھے گئے ہیں جیسے باب تفسیر القرآن۔ فضائل القرآن یا جمع القرآن وغیرہ ہیں۔ بلکہ صرف ایک ایسے باب کے نیچے اس حدیث کو بیان کیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایک خاص واقع کا بیان کرتی ہے یعنی باب غزوۃ بئر معونہ میں اصل مراد اس سے یہ تھی کہ ایک عبارت تھی جسے بعض لوگوں نے پڑھا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکا پڑھنا روک دیا اور اس کی وجہ معلوم کرنی مشکل نہیں کیونکہ ایسے کلام جو قرآن شریف کی آیتوں کی طرح پڑھے جاتے تھے انکو اگر روکا نہ جاتا تو بعد میں قرآن شریف کی آیات کے ساتھ مخلوط اور مشتبہ ہو جانیکا احتمال تھا اس لیے ان کا روک دینا ہی انسب تھا۔ غرض یہ صاف ظاہر ہے کہ حدیث محولہ بالا کو قرآن شریف میں نسخ ہونے سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن اگر بفرض محال یہ بھی مان لیا جائے کہ یہاں لفظ قرآن القرآن ہی کے مترادف واقع ہوا ہے۔ اور اس سے مراد قرآن شریف ہی کا کوئی جملہ ہے۔ تو اس صورت میں بھی اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فی الواقعہ قرآن شریف میں کوئی تنسیخ واقع ہوئی۔ اس حدیث میں یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ آنحضرت صلعم نے اس فقرہ کی نسبت فرمایا تھا کہ وہ قرآن شریف میں سے ہے۔ اور نہ یہ بات ہی ظاہر ہوتی ہے کہ آپ نے کبھی اسکو قرآن شریف میں لکھے جانیکا حکم دیا ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی شخص نے غلط فہمی سے اس فقرہ کو قرآن شریف کی آیت سمجھ لیا تھا۔ اور اس سے زیادہ انسؓ کے بیان کا اور کوئی مفہوم نہیں بن سکتا۔ لیکن آنحضرت صلعم نے اس فقرہ کو اسطرح پڑھنے سے منع کر دیا۔ پس جب تک کہ حدیث صحیح سے یہ بات ثابت نہ ہو کہ آنحضرت صلعم نے اس عبارت کی نسبت فرمایا تھا کہ یہ قرآن شریف کا جزو ہے اُسوقت تک ہم کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اسے جزو قرآن سمجھیں۔ بلکہ اگر کسی ایک آدھ صحابی نے غلط فہمی کیوجہ سے اسکو جزو قرآن سمجھ بھی لیا تو یہ اسکی اپنی غلطی تھی۔ یہاں تو یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم نے اسکو ایسا سمجھنے اور ایسا سمجھکر اسکو پڑھنے سے منع فرمایا تھا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جب ستر قاری کفار کی دغابازی سے شہید ہوئے۔ تو آنحضرت صلعم نے انکی اس حالت زندگی کا صحابہؓ کے آگے ذکر فرمایا جس میں وہ شہید ہو جانیکے بعد تھے۔ گویا وہ شہید ہی اپنی زبان سے اپنی حالت یوں بیان کر رہے تھے کہ "ہماری قوم کو خبر سنا دو کہ ہم خدا کے حضور میں باریاب ہو گئے ہیں۔ اور وہ ہم سے راضی ہے اور ہم اُس سے راضی ہیں۔" یہ کلام چونکہ بہت مؤثر تھا اور ایک مؤثر

واقعہ کے متعلق تھا اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ میں اس کا اتنا بڑا رواج ہو گیا کہ اکثر صحابہؓ اسکو بار بار پڑھا کرتے تھے اور ممکن ہے کہ کسی نے اسکو خدا کا کلام ہی سمجھ لیا ہو۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اندیشہ سے کہ مبادا کوئی شخص غلطی سے اسے خدا کے کلام میں داخل کر دے اور جزو قرآن قرار دیدے یہ حکم دیدیا کہ اس کو آیندہ کوئی شخص پڑھا ہی نہ کرے۔ یہ ہے حدیث شریف کا سارا منشاء اس کے سوائے اس حدیث سے اور کچھ واضح نہیں ہوتا۔

اگرچہ ہم نے حدیث کے الفاظ کے مفہوم سے ہی یہ دکھا دیا ہے کہ اس میں قرآن شریف کی کسی آیت کے منسوخ ہونے کا ذکر نہیں مگر اس کے سوا بھی بہت ساری اور باتیں ہیں جن سے یہی بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب کسی شخص کو ایک کام کے کرنیکی ہدایت کیجاتی ہے یا اسے ایک کام کے کرنے سے منع کیا جاتا ہے تو وہ ہدایت اور ممانعت اسوقت منسوخ سمجھی جاتی ہے جب اس شخص پر سے اسپر عملدرآمد کرنیکا بوجھ بالکل اٹھا لیا ئے۔ لیکن عبارت زیر بحث میں نہ کوئی حکم کسی کام کے کرنیکا ہے اور نہ کوئی ممانعت کسی فعل سے روکنے کے لیے ہے تو اسحالت میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کے منسوخ ہونیسے کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ اس عبارت میں تو چند شہیدوں کی آیندہ زندگی کا کچھ حال تھا جو دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ کیا انکی اس حالت میں کوئی تبدیلی واقع ہو گئی تھی؟ اسکا جواب تو ہر ایک ایماندار نفی میں ہی دے گا۔ پھر جبکہ وہ حالت گذشتگان جسکا ظاہر کرنا اس عبارت کی غرض اولی تھی کسی طرح متغیر نہیں ہوئی تو اس کے منسوخ سمجھنے سے غرض کیا سمجھی جائے۔ جو لوگ قرآن شریف میں ناسخ و منسوخ کے قائل ہیں وہ بھی یوں ہی بلاوجہ آیات قرآنی کے نسخ کے معتقد نہیں۔ بلکہ انکا اعتقاد یہی ہے کہ نسخ صرف ان آیات قرآنی میں واقع ہوا ہے جن میں یا تو کوئی امر ہے یا کوئی نہی ہے۔ اور اس کے لیے وہ لوگ یہ وجہ پیش کرتے ہیں کہ اوامر و نواہی سوسائٹی کی حالت پر تغیر و تبدل ہوتے رہتے ہیں۔ ایک وقت میں حالت سوسائٹی کسی خاص قسم کے اوامر و نواہی کا تقاضا کرتی تھی سو اس قسم کے اوامر و نواہی نازل ہو گئے۔ لیکن جب حالات بدل گئے تو ضروریات بھی بدل گئیں۔ اس لیے اسکے مطابق بعض اوامر و نواہی بدلائے گئے یعنی منسوخ ہو گئے اور انکی جگہ نئے اوامر و نواہی نازل کیے گئے۔ تو اس اصول پر بھی اول تو وہ عبارت جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے نہ کوئی امر ہے اور نہ کوئی نہی۔ اس لیے اس کے متعلق کسی طرح نسخ کا اعتقاد ہی جائز نہیں۔ پھر علاوہ بریں اگر بطور فرض محال اس کے لیے نسخ جائز بھی سمجھا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان شہیدوں کی اس حالت میں کسی قسم کا تغیر آگیا تھا۔ لیکن چونکہ انکی اس حالت میں کسی قسم کا تغیر ممکن ہی نہیں۔ تو اس عبارت کے منسوخ ہونیکا خیال بھی باطل ہے جس میں انکی اس حالت کا ذکر تھا۔ ماسوا اس کے اس بات کا بھی کوئی ذکر کسی نے نہیں کیا کہ اگر واقع میں یہ منسوخ ہو چکی تھی تو کونسی قرآنی آیت اس کی جگہ نازل ہوئی تھی جس نے اسکو منسوخ کیا۔ کیونکہ جن ہر دو آیات قرآنی کی بنا پر ناسخ و منسوخ کا اعتقاد بنایا گیا ہے ان دونوں کی منشا بھی یہی سمجھی گئی ہے کہ جب ایک آیت

منسوخ ہوتی ہے تو وہ اسوقت تک منسوخ نہیں ہوتی جب تک کہ اس کی بجائے کوئی آیت نازل نہ ہو۔ یعنی کسی آیت کو منسوخ کرنیکے لیے ضروری ہو کہ اس کی جگہ کوئی اور آیت نازل کیجائے۔ چنانچہ ان میں سے ایک آیت مانسخ من اٰیۃ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا ہے۔ جس کا ترجمہ ہے "ہم کسی آیت کو منسوخ نہیں کرتے یا اسے فراموش ہونے نہیں دیتے جبتک کہ اس سے بہتر یا اس جیسی نہیں لے آتے"۔ اور دوسری آیت واذا بدلنا اٰیۃ مکان اٰیۃ ہے جس کے معنے بھی یہی ہیں کہ ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلتے ہیں غرض معتقدان نسخ کے عقیدہ کے روسے بھی کسی آیت کو منسوخ نہیں مانا جا سکتا جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس منسوخ شدہ آیت کی بجائے کوئی دوسری آیت جو اس سے بہتر ہو یا اس جیسی ہو نازل نہیں ہوئی۔ اور یہ امر محض قیاس اور قرینہ پر مبنی نہ ہو بلکہ صریح اور واضح طور پر پتہ دیا جائے کہ یہ آیت فلاں آیت کی ناسخ ہے جو اس کے آنیسے منسوخ ہوگئی ہے۔ اور چونکہ نہ تو اس حدیث میں ہی اس بات کا ذکر ہے اور نہ اس کے سوا کسی اور شخص نے ہی کبھی اس بات کا پتہ دیا ہے کہ قرآن شریف میں فلاں آیت موجود ہے جو اس عبارت کی بجائے نازل ہوئی تھی۔ اس لیے ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ اس کے نسخ کے متعلق ہر ایک قرینہ سے بعید ہو یا قریب جب حدیث زیر بحث سے سمجھا جاوے اس کی تردید کریں۔

اب باقی ایک حدیث رہتی ہے۔ جو بجائے اس کے کہ قرآن شریف میں منسوخ آیات کے وجود کے اعتقاد کی تائید کرے ایسے معتقدان ناسخ و منسوخ کے اس عقیدہ کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑتی ہے۔ یہ حدیث اوپر نقل ہو چکی ہے اور اس کا ترجمہ بھی اوپر دیا جا چکا ہے مگر چونکہ یہاں اسکے متعلق بحث درپیش ہے اس لیے ہم پھر اسکا ترجمہ ذیل میں دیتے ہیں "ابن عباسؓ نے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ بے شک ہم میں ابیؓ بہترین قاری ہے اور علیؓ ہم میں بہترین قاضی ہے۔ اور بیشک ہم ابیؓ کی کوئی قرأت ترک کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ابیؓ کہتے ہیں کہ میں ترک نہیں کرونگا کوئی چیز جو مینے پیغمبر خدا صلعم سے سنی۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا فراموش کراتے ہیں تو اسکی بجائے اس سے بہتر یا اس جیسی لاتے ہیں" اس حدیث کے مطابق حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ نے بعض عبارات کو اسی آیت کے نفس مضمون پر غور کرکے ترک کر دیا جو اس حدیث کے اخیر میں درج ہے۔ لیکن ابیؓ نے انکو نہ چھوڑا۔ اب بغیر اس بات پر غور کرنیکے کہ وہ کیا چیز تھی جس کو انہوں نے ترک کر دیا لیکن ابیؓ نے نہ کیا۔ یہ بات حدیث مذکورۃ الصدر سے واضح اور عیاں ہے کہ جو کچھ حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ کے نزدیک منسوخ تھا وہ فی الحقیقت اسی وقت متروک ہوگیا تھا۔ اور قرآن شریف میں داخل ہی نہیں کیا گیا تھا۔ اور نہ ہی کبھی قرآن شریف کا جزو سمجھکر پڑھا جاتا تھا۔ اس حدیث کے روسے صرف ابیؓ ہی ایک تنہا انسان ..... ایسا ظاہر ہوتا ہے جو اسکو پڑھتا رہا۔ اور اگرچہ وہ

بہترین قاری مانا گیا تھا مگر تمام دوسرے صحابہؓ اس کے اسبارہ میں مخالف تھے۔ اس کا لب لباب یہی ہے کہ اگر کوئی عبارت کسی وقت منسوخ ہوئی تھی تو اسکو قرآن شریف میں جگہ نہیں دی گئی۔ اور نہ ہی اس قسم کی کوئی بات قرآن شریف میں موجود ہے۔ تمام صحابہؓ اسی بات کو حق جانتے ہیں۔ یہی معنے اس حدیث کے ہیں۔ اور اس کے سوا اس کے کوئی معنے نہیں ہو سکتے۔ اس لیے یہ بات بھی ضروری ہے کہ تمام احادیث جن میں کسی صحابی کی نسبت ایسا ذکر درج ہے کہ وہ گویا قرآن شریف میں ناسخ و منسوخ کے وجود کا قائل تھا انکے معنے ایسے اختیار کرنے چاہییں جو حدیث زیر بحث کے ساتھ متعارض نہ ہوں۔ ہم نے اوپر اس مضمون کی ساری حدیثوں کا ذکر کر دیا ہے اور یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ان حدیثوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فی الواقع قرآن کریم میں کوئی منسوخ شدہ آیت بھی ہے۔ اور اگر ان میں سے کوئی حدیث اس امر کی متعلق ہے بھی تو وہ اسیقدر کہ اس میں کسی صحابی کی شخصی رائے پر ہی مدار ہے اور انکی ایسی شخصی رائے بعض عبارتوں کے مفہوم میں غلط فہمی کی وجہ سے قایم ہوئی تھی۔ اور یہ ایسی غلطیاں تھیں کہ اکثر موقعوں پر اس قسم کی اکثر غلطیوں کو دوسرے صحابیوں نے بتا بھی دیا تھا۔ یہ حدیث انہیں نتایج کی تائید کرتی ہے جنپر اس سے پہلے ایک علیحدہ تحقیقات کر کے ہم پہنچے تھے۔ اور اس بات کا قطعی طور پر فیصلہ کر دیتی ہے کہ قرآن شریف میں کوئی منسوخ آیت موجود نہیں۔

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ مسئلہ ناسخ و منسوخ کے قائل آیات منسوخہ کو تین قسموں پر منقسم کرتے ہیں۔ (۱) وہ آیات جو منسوخ الحکم ہیں مگر منسوخ التلاوۃ نہیں (۲) وہ آیات جو منسوخ التلاوۃ ہیں مگر منسوخ الحکم نہیں (۳) وہ آیات جو منسوخ التلاوۃ بھی ہیں اور منسوخ الحکم بھی۔ پہلی قسم میں وہ عبارات اور آیات ہیں جو قرآن شریف میں موجود ہیں لیکن وہ لوگ یہ مانتے ہیں کہ جن اوامر اور نواہی پر وہ مشتمل ہیں وہ خارج از عمل ہو چکے ہیں کیونکہ ان آیتوں کو دوسری آیتوں نے منسوخ کر دیا ہے۔ مگر حدیث زیر بحث کے رو سے کسی ایسی آیت کا موجود ہونا ہی ممکن نہیں کیونکہ اس کے رو سے جو چیز منسوخ شدہ سمجھی گئی وہ ترک کر دی گئی تھی۔ ہم نے اس قسم کی تمام معتبر حدیثوں پر مفصل بحث کر دی ہے جن کی نسبت وہ لوگ مانتے ہیں کہ انمیں اس قسم کی آیتوں کے بعض حوالے ہیں۔ اس کے بعد دوسری قسم کی آیتیں ہیں یہ قسم تو ایسی ہے کہ جو بادی النظر میں ہی باطل ہے۔ کیونکہ جب کسی آیت کی نسبت یہ کہا جائے کہ اس کا حکم منسوخ نہیں ہوا مگر اس کے الفاظ منسوخ ہوئے ہیں تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ دراصل وہ امر یا نہی تو بحال ہے۔ لیکن جن الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اسکو نازل کیا تھا وہ قابل تلاوت نہیں نعوذ باللہ من ذٰلک اور اس نے حکم تو رہنے دیا مگر تلاوت الفاظ کو روک دیا۔ یہ ایک پرلے درجہ کی لایعنی بات ہے جسکو کوئی عقلمند مان ہی نہیں سکتا۔ اگر کسی آیت کا حکم بحال رہی تو

اس کے الفاظ کے نسخ سے کیا مراد سمجھی جا سکتی ہے؟ اگر اس سے یہ معنے ہیں کہ یہ الفاظ پہلے قرآن شریف کی جزو تھے اور یہی سمجھے جاکر پڑھے جاتے تھے۔ لیکن بعد میں ایسا کیا گیا کہ جو حکم انہیں تھا وہ بدستور مسلمانوں پر فرض اور واجب العمل رہا لیکن انکی تلاوت حکماً روک دیگئی۔ تو پھر یہ پوچھا جائیگا کہ اس راہ کو اختیار کرنیکی کن وجوہ سے ضرورت پیش آئی تھی۔ یا وہ کیا فایدے تھے جن کا حصول اس طرز کے اختیار کرنیسے متصور تھا؟ کیا اسکی یہ وجہ تھی کہ وہ الفاظ جن میں وہ حکم نازل کیا گیا تھا اس قابل نہیں سمجھے گئے کہ وحی الٰہی میں درج رہیں؟ کوئی شخص مسئلہ ناسخ و منسوخ کا قائل ہوکر اس سوال کا جواب یہ نہیں دے سکتا کہ وہ الفاظ کتاب اللہ میں رہنے کے قابل تھے نہ ہی روئے زمین پر کوئی معقول اور سمجھدار انسان ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جو ایسی صریح بغنہ متضاد باتوں کے ماننے کے جرم کا ارتکاب کرے کہ ایک وحی الٰہی کے لفظ وحی الٰہی میں رہنے کے قابل نہیں۔ اس کے سوا کوئی اور سبب بیان ہی نہیں ہوسکتا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس طریق کو اختیار کرنیسے کونسے فواید متصور تھے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کا کوئی جواب نہیں۔ اور ہم کسی آدمی کو اس کا ذرہ بھر کے برابر فایدہ دکھلا نہیں سکتے۔ بلکہ برعکس اس کے ایسے طریق کو اختیار کرنیسے بہت بڑے نقصانوں کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کا قرآن شریف کی حفاظت کا وعدہ ہے۔ اور یہ ایسا پختہ وعدہ ہے کہ جسکا عملدرآمد سیکڑوں برسوں سے بڑے فخر کے ساتھ تجربہ ہوتا چلا آیا ہے۔ پس اس الٰہی وعدہ حفاظت قرآن کریم کا فایدہ ان اوامر کو پہنچ سکتا ہے جو قرآن شریف میں شامل ہیں اور منسوخ نہیں ہوئے۔ اور وہی اوامر آجتک زندہ اور موجود رہنے کا فخر رکھتے ہیں۔ اور اسی وعدہ الٰہی کی حفاظت میں آئے ہوئے اوامر ہی نسلاً بعد نسل مسلمانوں کو پہنچے ہیں لیکن ایسے اوامر جن کے الفاظ (بقول معتقدان نسخ) قرآن شریف میں باقی نہیں رہے وہ چونکہ فی الحقیقت جزو قرآن نہیں رہے بلکہ خارج اور منسوخ از قرآن ہو چکے ہیں انکی حفاظت کا وعدہ الٰہی ذمہ وار نہیں ہوسکتا۔ منسوخ التلاوۃ آیات میں جو اوامر اور نواہی تھے انکا کھویا جانا یا مخلوط ہو جانا کسی حال میں امکان سے خارج نہیں ہوسکتا۔ کوئی شخص ایسا نہیں جو اس ضرورت الٰہی کی تشریح کر سکے۔ جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسا طریق اختیار کیا۔ آجتک کسی نے اس کا فایدہ ظاہر نہیں کیا اور ہم علیٰ وجہ البصیرت اور یقین کامل کے ساتھ کہتے ہیں کہ تا قیامت کوئی متنفس ایسا نہیں ہوگا جو واقعی طور پر اس کا کوئی ایک فایدہ بھی انشراح صدر کے ساتھ خود سمجھ سکے یا کسی دوسرے پر اسکو عیاں کر سکے۔ کیونکہ جب یہاں فایدہ کا وجود ہی نہیں تو اسکا سمجھنا سمجھانا کہاں سے وجود میں آسکتا ہے؟ لیکن بفرض محال اگر درحقیقت اس میں کوئی فایدہ ہوتا تو کم از کم اتنا تو آنحضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ضرور کرتے کہ اس قسم کے تمام اوامر کو ایک جگہ جمع کرنیکا حکم دیکر جمع کرا دیتے۔ کیونکہ اس طرح علیحدہ جمع کرانیسے ایک تو انکی حفاظت بھی کسی حد تک ہو جاتی اور مسلمانوں کو

اس بات کا علم بھی ہوجاتا کہ یہ اوامر اگرچہ قرآن میں شامل نہیں مگر جزو قرآن ضرور ہیں۔لیکن یہاں تو معاملہ ہی برعکس ہے۔آنحضرت صلعم نے نہ صرف انکے جمع کرنیکا حکم ہی نہ دیا اور جمع ہی نہ کرایا بلکہ کہیں کسی معتبر حدیث میں اتنا بھی ذکر نہیں آیا کہ کوئی ایک آیت بھی اس قسم کی ہے۔پس یہ امر ثابت ہے کہ جسطرح ان آیات کا وجود کوئی نہیں جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ منسوخ الحکم ہیں مگر منسوخ التلاوۃ نہیں۔اسی طرح اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ کوئی ایسی آیات فی الواقع موجود بھی ہیں جن کی تلاوت منسوخ مگر انکا حکم قایم ہے۔

دوسری قسم کے بعد اب تیسری قسم کی آیات پر غور کرنا باقی رہتا ہے جنکی نسبت کہا جاتا ہے کہ انکی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوگئے ہیں۔یعنی قائلین مسئلہ ناسخ و منسوخ کہتے ہیں کہ ایسی آیات بھی نازل ہوئی تھیں جن کی تلاوت بھی منسوخ ہوگئی۔اور وہ اوامر یا نواہی جو ان میں تھے وہ بھی منسوخ ہوگئے اور اسوجہ سے انکو قرآن شریف سے دونوں لفظی اور معنوی طور سے خارج کر دیا گیا۔وہ لوگ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ بعض حالات ایسے پیش آتے تھے کہ اس وقت کی ضرورت کا تقاضا بارگاہ ایزدی میں اس بات کی ضرورت پیش کرتا تھا کہ خاص اوامر یا نواہی وحی کے ذریعہ سے نازل کیے جائیں۔لیکن جب سوسائٹی کی حالت میں ترقی اور تبدیلی واقعہ ہوجاتی تو ان اوامر و نواہی میں بھی تبدیلی اور ترقی کی ضرورت سامنے آجاتی۔پس اس ضرورت کی وجہ سے پہلے اوامر و نواہی اُٹھائے جاتے اور منسوخ کیے جاتے اور انکی بجائے نئی آیات جن میں نئے اوامر و نواہی ہوتے نازل کیے جاتے۔ہم اس مصلحت یا ضرورت پر کوئی بحث نہیں کرتے بلکہ اسکا ثبوت مانگتے ہیں اور جبتک ہمیں اسکا ثبوت نہ دیا جاوے ہم اس کے معقول یا غیر معقول ہونیکی بحث میں پڑنیکی حاجت ہی نہیں سمجھتے۔صرف اتنا کہدینا تو ثبوت نہیں کہلا سکتا کہ اس قسم کی آیات کے نازل ہونے میں کوئی حرج نہیں۔یا ایسے حالات پیش آسکتے تھے۔ثبوت اسکا تو اسطرح پہنچ سکتا ہے کہ کوئی صحیح اور معتبر حدیث صاف اور واضح طور پر اسکی تائید میں پیش کیجائے اور اس سے دکھلایا جاوے کہ فی الواقعہ کوئی ایسی آیات پہلے تھیں جنکو آنحضرت صلعم آیات قرآن کریم کہتے تھے۔پھر بعد میں انکی جگہ اور آیات نازل ہونیکے سبب سے وہ منسوخ ہوگئیں۔اور قرآن شریف کے نسخوں میں سے خارج کردی گئیں۔ ضرور ہے کہ یہ ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا جاوے۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ معتبر احادیث سے اس بارہ میں کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ وہ بالکل ساکت ہیں ان میں کہیں اس قسم کے ایک واقعہ کا بھی مذکور نہیں پایا جاتا چاروں طرف سے پھر پھرا کر اس امر کی تائید میں صرف یہی ایک عبارت یعنی بلغوا عنا قومنا والی حدیث بعض لوگ پیش کرتے تھے جسکو ہم نے اوپر نقل بھی کردیا ہے اور اسپر بحث بھی کی ہے۔اور اس بحث میں ثابت کر دکھایا ہے کہ اول تو یہ عبارت قرآن شریف کی جزو کبھی نہیں ہوئی اور کہیں ثابت نہیں کہ آنحضرت صلعم نے جو مورد وحی تھے کبھی اسکو قرآن شریف کی جزو بیان کیا اور دوم یہ کہ اس عبارت میں نہ کوئی امر ہی تھا اور نہ کوئی نہی موجود تھی

بلکہ چند شہیدوں کی حالت بعد شہادت کا کچھ ذکر اس میں درج تھا جنکو کفار نے صرف اس قصور کے بدلے نہایت بے رحمی سے قتل کر ڈالا تھا کہ وہ کیوں اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

رہی سب سے آخری حدیث اس کی نسبت وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ گویا یہ حدیث تیسری قسم کی عبارات کے وجود کا ثبوت ہے۔ یعنی ایسی عبارات کے وجود کا ثبوت ہے کہ جو پہلے تو قرآن شریف کی جزو تھیں۔ لیکن بعد میں انکا مفہوم اور الفاظ سب منسوخ ہوکر قرآن شریف سے خارج کردیگئیں۔ اس نتیجہ کی بنا حضرت عمرؓ کے وہ کلمات ہیں جو حضرت ابن عباس کی روایت سے ہمیں پہنچے ہیں کہ بموجب منشاء آیت ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نأت بخیر منھا ابی بن کعب کی بعض قرائتیں ترک کردی گئی تھیں۔ اس موقع پر ہم اس آیت کے معنوں کے متعلق بحث نہیں کرنا چاہتے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد ہم ایک مستقل مضمون لکھیں گے جس میں اس آیت کے معنوں پر مکمل اور مفصل بحث کیجائیگی اور بدلایل قویہ یہ امر روشن کیاجائے گا کہ نسخ آیات سے اسجگہ قرآن شریف کا کیا منشا رہے۔ یہاں صرف سوال یہ ہے کہ ابی کی بعض قرأتوں یا اقوال کے ترک کیے جانے سے حضرت عمرؓ کی مراد کیا تھی اور اپنے دعوے کی تائید میں جو آیت آپنے پیش کی اس دعویٰ اور دلیل میں تعلق کیا تھا۔ واضح رہے کہ اصل متن حدیث میں لفظ قول آیا ہے اور ہم نے قول کا ترجمہ قرأت کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی حدیث بخاری میں دوسری جگہ منقول ہے اور دوسری کُتب میں بھی آئی ہے۔ وہاں کہیں تو بجائے قول کے لفظ قرأت آیا ہے اور کہیں لحن آیا ہے۔ اور یہ دونوں لفظ قریباً ایک ہی مراد رکھتے ہیں۔ لفظ قرأت اس حدیث میں آیا ہے جو ابن خلاد سے مروی ہے اور لحن اس حدیث میں ہے جو صدقہ سے روایت کی گئی ہے۔ لیکن صدقہ کی حدیث کی بخاری نے توثیق کی ہے۔ چنانچہ یہ حدیث باب القراء من الصحابۃ میں درج ہے۔ ہم اسجگہ اصل حدیث بخاری کو نقل کردیتے ہیں اور وہ یہ ہے عن ابن عباس قال عمر ابی اقرؤنا وانا لندع من لحن ابی و ابی یقول اخذ تہ من فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا اترکہ لشئ قال اللہ تعالیٰ ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نأت بخیر منھا او مثلھا۔ اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے۔ "ابن عباس نے روایت کیا کہ عمر نے کہا۔ ابی ہم سب میں بہترین قاری ہے اور ہم ابی کے بعض لحنوں یعنی طرز ادائے الفاظ کو ترک کرتے ہیں۔ اور ابی کہتا ہے کہ میں نے انکو رسول خدا صلعم کے مُنہ سے سُنا تھا۔ پس مَیں اس میں سے کچھ بھی ترک نہیں کرونگا۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ہم کوئی آیت منسوخ نہیں کرتے نہ ہی کسی آیت کو فراموش کراتے ہیں جبتک کہ اس کی جگہ اس کی مثل یا اس سے بہتر آیت نہیں لے آتے"۔ ان تینوں روایات کی متفقہ شہادت سے یہ بات قطعی طور پر فیصلہ پاجاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی مراد الفاظ قول یا لحن یا قرأت سے قرأت ہی تھی۔ ہمارے ناظرین اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہوں گے کہ عربی میں

اختلاف قوم و ملک اور رہن سہن بول چال کے لحاظ سے زبان میں کچھ اختلاف واقع ہوا تھا۔ اس قسم کے اختلاف کو قرأت کہتے ہیں اور قرآن شریف میں بھی مختلف اصول کے لحاظ سے کسیقدر مختلف قرأتوں کی اجازت دیگئی تھی اسپر مفصل بحث پہلے عنوان سبعۃ احرف کے نیچے ہم کر چکے ہیں اسجگہ یہ ذکر کیا گیا تھا کہ ابن مسعود اور ابیؓ کی طرف بعض قرأتوں کا اختلاف منسوب کیا جاتا ہے اور یہ بات بعض احادیث سے ثابت ہوتی ہے پس یہی وہ قرأتیں تھیں جن کی طرف حضرت عمرؓ کا اشارہ تھا۔ ہم نے اس امر کے متعلق بھی احادیث نقل کی تھیں کہ حضرت عمرؓ نے محاورہ قریش کے سوا دیگر محاوروں کی قرأتوں کو ترک کرنیکا حکم دیدیا تھا۔ یہ حدیثیں نتیجہ زیر بحث کی مؤید ہیں۔ ابیؓ بہترین قاری تھے۔ لیکن انہوں نے ان قرأتوں کے ترک کرنے سے انکار کیا جو آنحضرت صلعم کے دہن مبارک سے سنی تھیں۔ حالانکہ تمام دوسرے صحابی متفق اللفظ ہو کر کہتے تھے کہ ایسی قرأتوں کی ضرورت اب نہیں رہی۔ پس یہ حدیث بھی اسی مضمون پر متضمن ہے کہ ان قرأتوں کو ترک کر دیا جائے۔ اور ہم نے اوپر ثابت کر دیا ہے کہ قرأت سے مراد بعض الفاظ کے تلفظ کے طریق میں بعض جزوی اختلافات ہیں یا بعض چھوٹے چھوٹے اختلافات محاورہ سے مراد ہے۔ اس لیے اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی عبارت قرآن شریف میں سے منسوخ ہو کر خارج کی گئی تھی بلکہ یہ اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ حضرت ابیؓ بعض قرأتوں پر باصرار قایم تھے۔ اور دوسرے صحابہؓ کے نزدیک ان قرأتوں کو خارج از رواج کرنا ضروری تھا۔

اس جگہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت ما ننسخ من اٰیۃ الخ جو حضرت عمرؓ نے اس موقع پر پڑھی تھی اس کا اختلاف قرأت کے روکنے سے کیا تعلق تھا۔ اس آیت میں نسخ کا ذکر ہے عام اس سے کہ یہ نسخ الفاظ کا یا آیات منزلہ کا یا احکام الٰہی کا جو مسلمانوں یا پہلی امتوں کو دیئے گئے سمجھا جائے۔ لیکن اس بات پر بحث کرنا احاطہ مضمون ہذا سے خارج ہے اس لیے ہم یہاں اس آیت کے اس پہلو پر بحث نہیں کریں گے۔ البتہ اتنا واضح کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے کہ آیات قرآنی خواہ وہ کسی خاص مطلب اور محل کے لیے نازل ہوئی ہوں مگر یہ جائز ہے کہ ان سے مسائل مستنبط کیے جائیں۔ کیونکہ جہاں کہیں کسی مسئلہ کے متعلق کوئی صریح آیت نہیں ہوتی وہاں قرائن بعیدہ سے کسی ایسی آیت قرآنی سے مسئلہ مستنبط کیا جانا جائز ہے جو اسکو قریب مطلب رکھتی ہو۔ اور یہی صورت اس قسم کے استنباط کی کافی سمجھی جاتی ہے۔ اب اسجگہ اگرچہ یہ آیت مسئلہ زیر تجویز کے متعلق کوئی صریح حکم نہیں رکھتی لیکن اس امر کے متعلق کہ بعض قرأتیں جنکی ضرورت نہ رہی تھی انکو چھوڑ دینا ہی جائز تھا استنباط سے کام لینا ضروری ہو گیا۔ ہم نے ابھی ذکر کیا ہے کہ آنحضرت صلعم کے آخری ایام میں جب عرب کے قبیلوں کے قبیلے اسلام میں داخل ہونے لگے تو اسوقت بتقاضائے ضرورت

وقت آپ نے مختلف قبایل کو جو زبان محاورہ میں کچھ اختلاف رکھتے تھے انکے اس اختلاف کی وجہ سے مختلف قرأتوں سے قرآن شریف کے پڑھنے کی اجازت دی۔ اس کی ضرورت پڑھنے والوں کی طبعی ناقابلیت سے پیدا ہوئی تھی جسکو ہم نے ایک پہلے مضمون میں واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔ ان نو مسلم لوگوں میں بعض قبایل ایسے تھے کہ وہ قریش کے محاورہ کے مطابق تلفظ ادا کرنیکی قوت سے بالکل محروم تھے۔ اکثر ان میں ایسے پیران فرتوت تھے جن کو لکھنا پڑھنا نہ آتا تھا۔ تو ایسی حالت میں جب وہ لوگ مسلمان ہوتے تو انکے لیے یہ ناممکن بات تھی کہ اسیوقت قرآن شریف کو اصل قرأت نزولی کے مطابق صحیح طور پر پڑھ سکتے۔ اس لیے چونکہ دقت زیادہ تھی اور ایسے اختلاف قرأت سے دین میں کوئی حرج واقعہ ہونیکا اندیشہ نہ تھا۔ پس آنحضرت صلعم نے وحی الٰہی سے ان نو مسلموں کو اس ابتدائی حالت اسلام میں بعض الفاظ انکے اپنے رسم محاورہ کے موافق پڑھنے کی اجازت دی۔ گویا فی الحقیقت یہ اجازت بعض حالات کے موجود ہونیکی شرط سے مشروط تھی۔ اور ظاہر ہے کہ حالات کے بدلنے سے اجازت کا بھی جاتے رہنا ضروری تھا۔ پس جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو اسوقت اسلام بہت ترقی کر گیا تھا۔ عرب تو آنحضرت صلعم کی حیات میں مسلمان ہو چکا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے زمانہ میں لاکھوں لوگ غیر از عرب مسلمان ہو گئے۔ اور اسلام ایک جمعیت اور استقامت پکڑ گیا۔ اور وہ قومیں جن کو انکی ابتدائی حالت اسلام کی وجہ سے یہ رعایت قرأت میں دی گئی تھی اب اسلام میں بہت ترقی کر گئیں۔ اور محاورہ قریش میں خوب ماہر ہو گئیں تو اسوقت اس رعایت اور اجازت اختلاف قرأت کی ضرورت معدوم ہو گئی۔ اس لیے عام طور پر وہ قرأتیں متروک اور منسوخ ہو گئیں۔ لیکن ابی اور ابن مسعود بعض قرأتوں کے جاری رکھنے پر اصرار کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کو انکا اجرا منظور نہ تھا اس لیے انہوں نے انکو منع کیا اور یہ آیت پیش کی اور اس سے یہ مسئلہ مستنبط کیا۔ اور حق یہ ہے کہ صحابہؓ مسائل کا اکثر استنباط قرآن ہی سے کیا کرتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ جس آیت کو حضرت عمرؓ نے اس موقع پر پیش کیا وہ آیت نسخ آیات کے متعلق ہے۔ اور جب کوئی قانون مختص الزمان یا مختص الحالات نافذ کیا جاتا ہے اور وہ ضروریات مقامی اور حالات جو اس قانون کے نفاذ کا موجب ہوئے تھے معدوم ہو جاتے ہیں تو وہ قانون بھی منسوخ سمجھا جاتا ہے۔ یہی وہ عام مفہوم ہے جس میں لفظ نسخ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے ایسے موقعہ پر اس آیت کو پڑھا جس سے انکا مطلب یہ تھا کہ جس حال میں اس آیت قرآنی کی رو سے کوئی امر بھی منسوخ ہو سکتا ہے تو یہ اختلاف قرأت بھی جو ان حالات اور ضروریات مقامی کے نہ رہنے سے منسوخ ہو گیا ہے خارج از عمل کر دیا جائے۔ یہی وہ استنباط تھا جو حضرت عمرؓ نے اس آیت سے سمجھا اور اپنے دعوے کی تائید میں پیش کیا۔ پس اس آیت کا اس حدیث کے ساتھ جو رشتہ ہے وہ ظاہر اور ثابت ہے۔

اب ایک سوال اس حدیث کے متعلق باقی رہا کہ علی اقضانا جو اس حدیث میں ابی اقرونا کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں۔

اس سے کیا منشا ہے۔ اگر سوچا جائے تو یہ جملہ بھی ہمارے ہی مطلب کی تائید کرتا ہے۔ اگرچہ اگر ہم کوئی تعلق نہ بھی دکھا سکتے تو اس سے معنوں کی صحت میں کوئی فرق نہ آسکتا تھا۔ کیونکہ دوسری جگہ جہاں یہی حدیث بخاری نے لکھی ہے وہاں یہ جملہ علی اقضانا موجود نہیں جیسا کہ منقولہ بالا حوالہ سے ظاہر ہے۔ علاوہ ازیں حدیثوں کے سلسلہ میں ہمکو ایسا بھی نظر آرہا ہے کہ کسی حدیث میں ایک واقعہ بیان ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ایک اور واقعہ بیان ہوتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں واقعات میں کوئی بعید ترین تعلق ہوتا ہے جو انکے اکٹھا ذکر کرنیکا موجب ہوتا ہے۔ مثلاً اسی معاملہ میں ظاہر ہو رہا ہے کہ اگر کوئی اور تعلق ثابت نہ بھی ہو تو بھی اسقدر تعلق تو ضرور عیاں ہے کہ دو صحابیوں کے اعلیٰ فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن بات صرف یہیں تک ہی محدود نہیں اس سے بڑھکر اور گہرا تعلق انکے درمیان موجود ہے۔ اس حدیث میں آیا ہے کہ ابیؓ بہترین قاری قرآن شریف کے تھے۔ مگر باوجود اس کے ان کا بہترین قاری ہونا مسلم تھا مگر اس سے ان کو یہ حق حاصل نہیں ہو گیا تھا کہ وہ قرآن شریف میں اتنا دخل دیتے کہ جو قرأت چاہتے اسی کو قرآن میں شامل رکھتے۔ یہ منصب قاری کا نہ تھا بلکہ ایسے شخص کا تھا جسکو قرآن شریف سے مسائل کے استنباط کرنیکی اعلیٰ درجہ کی قوت عطا کی گئی ہو اور جو اعلیٰ درجہ کی قوت فیصلہ سے مرصع ہو۔ چنانچہ اس منصب کے لیے حضرت علیؓ مسلّم تھے اور یہی وجہ تھی کہ اس موقع پر قرآن شریف کا ذکر کرنے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام نامی کا اس حیثیت میں ذکر کیا گیا۔ غرض یہ ایک قضیہ حضرت عمرؓ کے سامنے تھا کہ ابی بعض قرأتوں کے اجرا پر اصرار کرتا تھا اور دوسرے صحابیؓ جن میں حضرت علیؓ بھی تھے اسکی مخالفت کرتے تھے۔ اسپر حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس میں شک نہیں کہ ابیؓ ایک جلیل القدر قاری ہیں لیکن وہ اس امر میں حکم نہیں ہو سکتے۔ انکی فضیلت کی حد قرأت تک ہی ختم ہے۔ یہ منصب ایسے شخص کا ہے جس میں قوت فیصلہ اور قوت استنباط مسائل از قرآن شریف اعلیٰ درجہ کی ہو اور چونکہ حضرت علیؓ اسبات کا شرف رکھنے میں مسلّم ہیں اس لیے خلیفۃ المؤمنین نے جو ان مجالس کے صدر اور امیر تھے اس بات کے ساتھ اتفاق کر کے وہی فیصلہ کیا جسپر حضرت علیؓ پہنچے تھے اور وہی دوسرے صحابہؓ کی بھی رائے تھی۔ اور ان کلمات کے بیان سے یہ ظاہر فرمایا کہ جو کچھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں وہی مختار ہونا چاہیئے۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانوں میں عام صحابہؓ کا متفق طور پر باستثنائے ابی و ابن مسعود اسی پر اتفاق تھا۔ بلکہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں آکر ابیؓ بھی اسی پر متفق ہو گئے۔ پھر اگر کسیقدر اختلاف کی آواز سنائی دیتی تھی تو وہ ابن مسعود کی آواز تھی۔

اسی کی تائید میں ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے۔ یہ ثابت شدہ بات ہے کہ کسی حدیث میں ایک جملہ بھی ایسا موجود نہیں جو کسی امر الٰہی پر متضمن ہو اور جس کی نسبت یہ امر صریح طور پر ظاہر کیا گیا ہو کہ وہ کسیوقت

جزو قرآن شریف تھا اور پھر حکم کے بدل جانیکی وجہ سے وہ بعد میں منسوخ ہوگیا۔ جبکہ یہ حال ہے کہ کوئی ایک آیت بھی اس طرح سے منسوخ شدہ کہیں پائی نہیں جاتی تو یہ ایک قطعی اور مضبوط ثبوت اس بات کا ہمارے ہاتھ میں ہے کہ حسب اقتضائے وقت وحالات اختلاف قرأت کی اجازت دی گئی تھی۔ لیکن اس زمانہ کے بعد حالات کے بدل جانے پر وہ اجازت واپس لے لیگئی۔ پس جو معانی اور مفہوم ہم نے اختیار کیے ہیں انکی تائید میں یہ ایسے واقعات ہیں کہ جن سے انکار ممکن نہیں۔ یہ واقعات فریق مقابل کے خیالات اور قیاسات کو بے بنیاد ثابت کرتے ہیں بفرض محال اگر حضرت عمرؓ کی منشا اس آیۃ سے یہ بھی ہوتی کہ قرآن شریف کی بعض آیات منسوخ ہوگئی ہیں جن کو ترک کردیا گیا ہے (گو لفظ لحن اور قرأت جو معتبر احادیث میں آئے ہیں اسکی کھلی کھلی تردید کرتے ہیں) تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ ان آیتوں کا پتہ ونشان قطعی طور پر صفحہ دنیا سے محو ہوجاتا؟ اگر ہم یہ بھی خیال کریں کہ حضرت عمرؓ کی مراد یہ تھی کہ آیات قرآنی کا نسخ ہونا ممکن ہے تو بھی ایک ذرہ بھر کے برابر اس قسم کی شہادت موجود نہیں کہ واقع میں کوئی آیت منسوخ بھی ہوئی تھی۔ اور یہی وہ بات ہے جس کا ثابت کرنا ہمارا مقصد تھا ہمیں اس بحث میں پڑنیکی کوئی ضرورت نہیں کہ کسی آیت قرآنی کا منسوخ ہونا ممکن تھا یا نہیں۔ ہمارا نفس مضمون امکان اور عدم امکان نسخ سے بہت پرے ہے۔ ہم نے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا فی الحقیقت کوئی آیت قرآنی منسوخ ہوئی؟ اور یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہو چکی ہے کہ کوئی آیت بلکہ کوئی لفظ قرآن شریف کا ایسا نہیں جو منسوخ سمجھا جاسکے۔ اور یہی ثابت کرنا تھا۔ (باقی آیندہ)

ہندوستان میں عیسائی مذہب کے پھیلانیکی نئی تجاویز

دو مشہور پادری صاحبان نے اس وقت دو نئی تجویزیں عیسائی مذہب کے ہندوستان میں کامیاب بنانے کے لیے کی ہیں۔ ان میں سے ایک تجویز تو بشپ مدراس کی ہے جسکا ماحصل یہ ہے کہ ہندوستان میں پادریوں کو تمام کوشش نیچ ذاتوں پر جیسے چوہڑے چمار پاریہ وغیرہ ایسی قوموں پر کرنی چاہیئے کیونکہ عیسائی مذہب کو زیادہ تر قبول کرنیوالے لوگ انہی میں سے نکلتے ہیں اور انکے مقابل اونچی ذاتوں میں عیسائی مذہب کو کوئی کامیابی نہ حاصل ہوئی ہے اور نہ آیندہ حاصل ہونیکی امید ہے۔ دوسری تجویز مسٹر سیلٹر کی ہے جو مسلمانوں میں مشن قایم کرنے پر زور دیتے ہیں وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام نے جو تعلیم خدائے تعالیٰ کے متعلق پیش کی ہے وہ سچی تعلیم ہے اور اسلام زندہ اور سچے خدا کو پیش کرتا ہے اور وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ فطرت انسانی کے مطابق جو مذہب کے اصول ہوسکتے ہیں اسلام اُنپر ایک سادہ ایمان لانیکے لیے بلاتا ہے مگر انکے نزدیک اسلام میں بعض ایسی باتیں موجود نہیں جن کا ہونا مذہب کی زندگی

کے لیے ضروری ہے۔ اور مثال کے طور پر وہ مسیح کے انکی امیدوں کو پیش کرتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ ضروری بات جو مسٹر سلیٹر نے پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ عیسائیوں کو مسلمانوں کے ساتھ بحث مباحثہ کے رنگ میں جس کا نتیجہ سخت کلامی ہوتی ہے پیش نہیں آنا چاہیئے بلکہ اسلام کے ساتھ جو انکے تعلقات ہیں ان میں ایک ہمدردی کا رنگ اختیار کرنا چاہیئے۔

اس دوسری تجویز سے پادری صاحب کی کوئی غرض ہو ہمیں اس کے پڑھنے سے ایک خوشی بھی ہے عیسائیوں نے جو مباحثات کے رنگ میں اسلام کے خلاف ایک بڑا بھاری انبار لٹریچر کا تیار کیا ہے وہ عموماً پرلے درجہ کا گندہ لٹریچر ہے اور نہایت سخت حملے کیے گئے ہیں۔ پس اگر مسٹر سلیٹر کی تجویز سے اور کچھ نہیں تو اسیقدر فائدہ ہو جائے کہ پادری صاحبان اسلام اور اس کے مقدس بانی اور رہبروں پر حملے کرنیکا گندہ طریق بدل دیں تو یہ انکی ایک بڑی بھاری خدمت عیسائی مذہب کے لیے ہوگی اور جو حقارت اور نفرت پادری صاحبان کی اس گندہ دہانی اور درشت کلامی سے مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہو چکی ہے اس کے رفع کرنے میں بھی یہ طریق مفید اور مؤثر ہوگا اور اس طرح پر مسلمانوں سے نہیں بلکہ یہ انکی اپنی قوم سے ہمدردی ہوگی۔ مسٹر سلیٹر کہتے ہیں کہ پادریوں نے ابتک مسلمانوں میں تبلیغ کی طرف توجہ نہیں کی یا زیادہ کوشش نہیں کی۔ یہ بات تو بالکل غلط ہے۔ پادری صاحبان نے جہاں تک ان کا زور تھا لگایا مگر وہ خوب جانتے ہیں کہ اسلام پر انکے داؤ چل نہیں سکتے۔ ہاں ہندوستان میں پادری صاحبان نے اسلام کے متعلق جو پہلو اختیار کیا ہے وہ ایک نہایت غلط طریق ہے اور اسکی اصلاح کی بیشک بڑی بھاری ضرورت ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ مسلمانوں کے سامنے عیسائی مذہب کی کوئی خوبیاں بیان کرتے انہوں نے یہ طریق اختیار کر رکھا ہے کہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اور مسلمانوں کے مقدس بزرگوں پر ایسی بیجا تہمتیں اور گندے الزام لگاتے ہیں اور انکا ذکر ایسے پُرحقارت اور فحش طریق میں کرتے ہیں جو مسلمانوں کے دلوں کو سخت دُکھ پہنچانیوالا ہے۔ انکی یہ رنجیدہ تحریریں معمولی درشت کلامی کی حد سے جو بحث مباحثہ میں بعض اوقات ہو جاتی ہے بہت آگے گذری ہوئی ہیں حتّٰی کہ خود بعض عیسائیوں نے اس قسم کی تحریروں پر ان لوگوں کو ملامت بھی کی چنانچہ آج سے بہت سال پیشتر شمس الاخبار لکھنؤ نے جو باہتمام پادری کریون صاحب نکلتا تھا ۱۵۔ اکتوبر ۱۸۷۵ء کے پرچہ میں پادری عماد الدین کی تصنیفات کا اور اس سے جو دُکھ مسلمانوں کو پہنچا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ " اگر ۱۸۵۷ء کی مانند پھر غدر ہوا تو اس شخص کی بدزبانیوں اور بیہودہ گوئیوں سے ہوگا " انکا یہ کہنا صرف پادری عماد الدین کی دریدہ دہنی کی وجہ سے تھا جس نے مسلمانوں کا دل دُکھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ورنہ مسلمان خوب جانتے ہیں کہ پادری صاحبان اور گورنمنٹ ایک چیز نہیں۔ گورنمنٹ کے تو احسانات مسلمانوں پر اسقدر ہیں کہ جنکا وہ کسی طرح شکریہ ادا نہیں کر سکتے اور پادری صاحبان نے انکو اسقدر دُکھ پہنچایا ہے کہ جسکا رنج انکے دلوں سے کبھی دُور نہیں ہو سکتا

پادری صاحبان میں سے خصوصاً ان لوگوں کی تحریروں میں نہایت ہی بیباکی سے کام لیا گیا ہے جو دیسی عیسائی کہلاتے ہیں کوئی گندہ سے گندہ لفظ ایسا نہیں جو ان بیباکوں نے سرور انبیاء فخر بنی آدم کے لیے استعمال نہ کیا ہو انکی بعض تحریریں شروع سے لیکر اخیر تک ایسی گندی ہیں کہ کوئی مسلمان نہیں جو انکی ایک سطر پڑھے اور کانپ نہ اُٹھے۔ یہ حال ابتدائی تحریروں کا ہی نہیں بلکہ ابتک بعض پادری صاحبان کی تحریروں میں یہی رنگ چلا جاتا ہے۔ ابھی تھوڑے دنوں کا ذکر ہے کہ ایک پادری صاحب نے کتاب امہات المومنین لکھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواج مطہرات پر نہایت ناپاک اور گندے حملے کیے۔ چنانچہ اس صوبہ کی ایک انجمن یعنی انجمن حمایت اسلام لاہور نے گورنمنٹ پنجاب کی خدمت میں ایک عرضداشت بھی اس کے متعلق بھیجی تھی اور اسمیں گورنمنٹ کو توجہ دلائی تھی۔ کہ یہ کتاب سخت دل آزار طریق میں لکھی گئی ہے۔ اگرچہ جہانتک ہم دیکھتے ہیں اب وہ اس وحشیانہ اور گندے طریق کو کسی قدر چھوڑ رہے ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ اگر کوئی پادری صاحب عیسائیت کے لیے اپنے دل میں سچی ہمدردی رکھتے ہیں تو ان کا سب سے پہلا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کو اس دل آزار اور گندہ طریق سے روکیں۔ ایسے ناپاک حملے اگر وہ لوگ اسلام اور اسکے مقدس بانی پر کر سکتے ہیں تو انسے بچا ہوا کون ہے بلکہ جیسے سخت حملے یہودیوں اور اب دہریوں نے حضرت مسیح علیہ السلام پر اور عیسائی مذہب پر کیے ہیں اور جسطرح پر اول الذکر نے نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کو ہی ناجائز ثابت کرنا چاہا ہے اس سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہیئے تھا کہ کسی مذہب کی صداقت پر بحث کرنیکا یہ طریق نہیں ہے۔ مگر افسوس ہے کہ باوجود ان سب باتوں کے ابتک جو پرچے یا رسالے پادری صاحبان کے اہتمام سے نکلتے ہیں انہوں نے اس گندہ طریق کو چھوڑا نہیں۔ اور بجائے اس کے کہ انکی تحریروں سے ملک پر ایک نیک اثر پڑتا اردو لٹریچر پر ایک زہریلا اثر انکا ہو رہا ہے اور انہی کی دیکھا دیکھی آریہ سماج نے بھی یہی طریق اختیار کر لیا ہے بعض ایسے رسالے جو بڑی تہذیب اور نرمی کے دعووں کے ساتھ نکلنے شروع ہوئے تھے وہ بھی خود آخر اسی طریق میں جا پڑے۔ ایک مثال اس کی بائبل سوسائٹی لاہور کا مذہبی رسالہ تجلی ہے۔ اس کے ایڈیٹر صاحب ایک مدت تک یہ وعظ کرتے رہے کہ مذہبی مباحثات میں بڑی نرمی اختیار کرنی چاہیئے اور ملائمت سے ایک دوسرے کو اسکے مذہب کے نقص یا اپنے مذہب کی خوبیاں بتانی چاہیئیں مگر جب خود اس میدان مباحثہ میں نکلے تو انہوں نے اور انکے نامہ نگاروں نے ایک ایسا گندہ طریق اختیار کیا کہ رحمت خدا بر نباش اول کی مثل یاد آتی ہے۔ استہزا۔ تحقیر۔ دل آزاری دریدہ دہنی میں وہ پہلوں پر سبقت لے گئے۔ خدا اس قوم کو ہدایت دے کہ ایک عورت کے بیٹے کو خدا بنانے کے لیے خدا کے قدوسوں اور راستبازوں کو کسقدر گالیاں دیتے ہیں۔ اگر انکا جی گالیاں دے کر ہی خوش ہوتا ہے تو وہ دیتے رہیں ہمارا اس سے کچھ نہیں بگڑتا مگر وہ یاد رکھیں کہ ایک خدا بھی سر پر موجود ہے

جو بیباکوں نے شریروں سے ضرور مواخذہ کریگا۔ اسی رسالہ تجلی نے جس کا مینے ذکر کیا ہے منجملہ دیگر دل آزار طریقوں کے ایک یہ طریق بھی اختیار کر رکھا ہے کہ بانی سلسلہ احمدیہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا نام سوائے کذاب کے نہیں لیتا اور اسی نام سے اپنی تحریروں میں بار بار خدا کے اس برگزیدہ کا ذکر کرتا ہے۔ ہم نے اسکو ایک رسالہ میں یہ توجہ دلائی تھی کہ اس سے حاصل تو تم کو کچھ نہیں ہوگا۔ اور نہ ان طریقوں سے تم خدا کے کاموں کو روک سکتے یا خدا کے سلسلہ کو نقصان پہنچا سکتے ہو ہاں اس طرح تم ایک تین چار لاکھ انسانوں کی معزز جماعت کا دل دکھاتے ہو جس کا جواب ہم کو یہ دیا گیا ہے کہ ہم چونکہ بانی سلسلہ احمدیہ کو کذاب ہی سمجھتے ہیں اس لیے انکا ذکر اس نام سے کریں گے۔ اگر پادری صاحبان کے نزدیک یہ دلیل ہے تو انکو اختیار ہے جس طرح چاہیں ذکر کریں یا اس سے بھی گندہ الفاظ استعمال کریں مگر اتنا سوچ لیں کہ اگر ایک یہودی جو حضرت مریم صدیقہ پر (نعوذ باللہ من ذلک) زنا کا بہتان لگاتا اور حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت کو ناجائز ٹھہراتا اور اس بات کا یقین رکھتا ہے اور پھر حضرت مسیح کو نبوت کے دعویٰ میں بھی جھوٹا سمجھتا ہے۔ ایسا یہودی اگر بجائے حضرت عیسیٰ یا انکی والدہ کا نام لینے کے اسی قسم کے الفاظ سے انکا ذکر کرے اور اپنے اعتقاد کو ہی دلیل پیش کرے تو اس سے انکے دلوں کو کسقدر رنج پہنچے گا یہی رنج وہ اسوقت بلاوجہ سلسلہ کے تین چار لاکھ انسانوں کو پہنچا رہے ہیں۔ اور ہم جو کبھی یہودیوں کے ان الزامات کا ذکر کرتے ہیں جو وہ حضرت مسیح پر لگاتے ہیں تو نہ اس لیے کہ ہم ان باتوں سے خوش ہوتے ہیں ہرگز نہیں ہمارے نزدیک یہ کفر ہے اور ہم ان انبیاء کے برا کہنے والوں پر اسی طرح لعنت بھیجتے ہیں جیسا آج ان دوسروں پر جو خدا کے قدوسوں اور راستبازوں کو گالیاں دیتے اور انکو کذاب کرکے پکارتے ہیں۔ ہماری غرض تو صرف ان لوگوں کو توجہ دلانا ہے کہ تمھیں گالیاں دیکر خوش نہ ہونا چاہیئے کہ ہم نے جیت لیا اسی طرح تمھارے بڑوں نے اپنے اپنے وقت میں انبیاء کو طرح طرح کے دکھ دیئے ہم تو صرف اسلیے ان باتوں کو پیش کرتے ہیں کہ تا اگر کسی کے دل میں حق کی طلب کا کچھ نشان ہے تو وہ ان باتوں سے سبق لے اور اس گندہ طریق سے توبہ کرے اور اپنے بیباک بھائیوں کو سمجھا دے کیونکہ وہ شخص جسکو آج اس کے اصل مرتبہ نبوت سے بڑھا کر خدا بنایا جاتا ہے اسپر بھی اپنے وقت میں اسی طرح ہنسی اور ٹھٹھا کیا گیا اور گالیاں دی گئیں اور تم تو آج ایک برگزیدہ کو کذاب لکھکر خوش ہوتے ہو اسے خدا جانے کیا کیا دل آزار کلمے کہے گئے ہوں گے جو خدا کو اپنے کلام میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کرنا پڑا۔ وقولھم علیٰ مریم بھتاناً عظیما۔ یاد رکھو کہ انہی لوگوں کے نقش قدم پر تم چلتے ہو اور جس طرح آج تم اُنپر لعنت بھیجتے ہو پیچھے آنیوالی نسلیں تم پر لعنت بھیجیں گی۔ کہ تم نے خدا کے برگزیدہ کا ایک نہایت ہی گندہ اور تہذیب سے گرے ہوئے طریق سے مقابلہ کیا۔ ہم خدا کے کسی برگزیدہ کو بھی برا نہیں کہتے کیونکہ ہماری کتاب تو ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ خدا نے ہر اُمت میں رسول بھیجے جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنے

اپنے ملکوں میں اصلاح کی مگر پیچھے آنیوالی نسلوں نے انکے دین کو بگاڑ دیا جسطرح عیسائیوں نے مسیح کے دین کو بگاڑ دیا۔ اور اس لیے خدا نے اپنے وعدوں کے موافق ایک مصلح اس آخری زمانہ میں تمام قوموں کے لیے بھیجا۔

پھر اصل مضمون کی طرف توجہ کر کے ہم کہتے ہیں کہ پادری صاحبان کی تحریروں کو دل آزاری کے طریق سے ہٹانا کوئی آسان کام نہیں لیکن چونکہ مسٹر سلیٹر کی تجویز اصلاح مباحثات کے متعلق بہت ہی کے قریب قریب معلوم ہوتی ہے اس لیے اگر وہ پوری کوشش اس میں کریں تو جو فائدہ وہ اس سے اُٹھانا چاہتے ہیں اس سے قطع نظر کر کے ہم اسقدر ضرور کہیں گے کہ یہ عیسائی مذہب پر انکا تھوڑا احسان نہوگا کہ ایک ایسی بڑی غلطی کو اس کے واعظین میں سے دُور کر دیں جس غلطی کی وجہ سے بہت سے انسانوں کا دل دُکھ رہا ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جسقدر نفرت اب عام عیسائی واعظین کیطرف سے دلوں میں ہے وہ جاتی رہے گی۔ البتہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ عیسائی واعظین کو چاہیئے کہ عیسائیت کو اس رنگ میں مسلمانوں کے سامنے پیش کریں کہ یہ گویا اسلام کا تکملہ اور تتمہ ہے جو اس کی صداقتوں کو سچا کر کے دکھاتا ہے یہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ عیسائی مذہب اسلام کا تکملہ اور تتمہ کن معنوں کی رو سے ہو سکتا ہے؟ اور اسلام کی توحید اور اسلام کی تعلیم میں وہ کونسا نقص اور کونسی کمی ہے جسکو عیسائیت نے پورا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ عیسائی مذہب کے اصول سچے مذہبی اصول کی بگڑی ہوئی صورت کو پیش کرتے ہیں اور اسطرح پر کہہ سکتے ہیں کہ عیسائی مذہب اسلام کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ اگر عیسائی مذہب اصل مذہبی صداقتوں کو اسطرح بگاڑ کر پیش نہ کرتا جسطرح وہ اسکی موجودہ تعلیم میں پیش کی گئی ہیں تو علم اور سائینس کی رَو کے آگے یہ اسطرح بہ نہ جاتا۔ اور اگر مذہب تعلیم یافتہ دنیا کے سامنے عیسائی مذہب کی صورت میں پیش نہ ہوتا تو کبھی آج مذہب سے وہ نفرت نہ ہوتی جو مغرب میں ہو رہی ہے۔ صرف عیسائی مذہب کے خراب اصول ہی مذہب کو بدنام اور ذلیل کرنے کا باعث ہوئے ہیں۔ جن باتوں کو اسلام کی تکمیل کرنے والی بتایا جاتا ہے وہی وہ باتیں ہیں جن کو آج تعلیم یافتہ لوگ کھلے طور پر رد کر رہے ہیں۔ اور جن کو قرآن شریف نے آج سے تیرہ سو سال پہلے رد کیا تھا۔ بہر حال ہمیں اس بات پر کچھ اعتراض نہیں بلکہ خوشی ہے کہ پادری صاحبان اپنے مذہب کی خوبیاں اور کمال بیان کریں کیونکہ ایک تو اس سے عیسائی مذہب کا موازنہ اسلام کے ساتھ ہو سکے گا اور دوئم پادری صاحبان کی توجہ بجائے گالیاں نکالنے کے اس طرف ہو جائیگی۔

اس تجویز کے کرتے ہوئے اسکا مجوز یہ بھی کہتا ہے کہ اسلام میں ایک بڑا بھاری نقص یہ ہے کہ اس میں کسی مسیح کے آنیکی امید نہیں دلائی گئی اس میں تو شک نہیں کہ عیسائی مذہب کی طرح اسلام مسیح کے متعلق خدائی دعووں سے خالی ہے اور یہ اگر پادری صاحبان کے نزدیک نقص ہے تو ہو اسلام عیسائی مذہب کی طرح یہ نہیں سکھاتا کہ عورت کا بیٹا واقعی خدا بن سکتا ہے ہاں اسکی تعلیم یہ ہے کہ ایک انسان باخدا انسان بن سکتا ہے مسیح کے آنیکی پیشگوئی تو اسلام میں موجود ہے معلوم نہیں پادری صاحب کو یہ دھوکہ کیونکر لگا کہ اسلام میں مسیح کے آنے کا

انتظار کوئی نہیں۔ بلکہ اسلام نے تو وہ امیدیں پوری ہوتی بھی دیکھ لیں اور مسیح کو پالیا حالانکہ عیسائی لوگ ایک فضول انتظار میں آسمان کی طرف آنکھیں لگائے بیٹھے ہیں اور ابتک خدا کے مسیح کی شناخت سے محروم ہیں۔ یہی حال اس سے پہلے یہودیوں کا ہوا تھا کہ انکو ایک مسیح کا وعدہ دیا گیا لیکن جب وہ مسیح اپنے وقت پر آیا تو چونکہ اس کے آنے سے انکی ساری امیدیں پوری نہ ہوئیں اس لیے انہوں نے اسکو قبول نہ کیا سو یہی حال اب ہو رہا ہے مسیح آگیا مگر جیسا کہ پہلے سے بتایا گیا تھا اس کا اسی طرح انکار کیا گیا جسطرح پہلے لوگوں نے کیا۔

عام طور پر عیسائیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ مسیح کی آمد ثانی کے وقت کل قومیں عیسائی مذہب میں داخل ہو جاوینگی مگر جس مجوز کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ یہ خیال کرتا ہے کہ مغربی تعلیم کے پھیلنے سے مسلمان کثرت سے عیسائی مذہب میں داخل ہو جاوینگے۔ یہ محض اپنے آپ کو یا دوسرے لوگوں کو دھوکہ دینا ہے۔ دنیا خوب دیکھ رہی ہے کہ مغربی تعلیم کے پھیلنے سے خود عیسائی ممالک میں عیسائی مذہب کا کیا حال ہوا ہے اور کسطرح سمجھدار آدمی اسے رد کرتے چلے جاتے ہیں اسپر یہ امید رکھنا کہ ایسی تعلیم کے ہندوستان میں پھیلنے سے لوگ عیسائی بنجائیں گے تجربہ کے سر پر خاک ڈالنا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ آیا مغربی تعلیم کے پھیلنے سے اسلام پر سے مسلمانوں کا اعتقاد اٹھ جائیگا یا وہ لامذہب ہو جاویں گے۔ جیسا کہ عیسائی مذہب پر اس تعلیم کا اثر ہوا ہے یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہم زور سے نفی میں دیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ مغربی تعلیم کے دلدادوں میں عملی کمزوری بہت پائی جاتی ہے مگر جہانتک ہم دیکھتے ہیں اسلام کے بنیادی اصول ویسے ہی محکم ہیں اور نہ صرف یہی کہ مغربی تعلیم کا ان بنیادی اصول پر کوئی برا اثر نہیں ہوا بلکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خود مغرب میں جو ایک عالمگیر مذہب کے لیے نئے نئے اصول قرار دیئے جا رہے ہیں وہ اسلامی اصول کے ساتھ ملتے چلتے ہیں اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ جیسے جیسے عیسائی مذہب کا اثر دلوں سے کم ہوتا جاویگا اسلامی اصول دلوں میں جگہ پکڑتے جاویں گے جہانتک واقعات کو دیکھکر ہم کہہ سکتے ہیں وہ وقت آرہا ہے کہ اسلام ساری دنیا میں پھیلے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ لیظہرہ علی الدین کلہ کا تو تیرہ سو۱۳۰۰ سال کا ہے۔ رہی یہ بات کہ مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں کسیقدر عملی کمزوری یا کسی قدر مذہب کی طرف سے لاپروائی کیوں پائی جاتی ہے اس کی وجہ اصل میں یہ ہے جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہم ایک دفعہ لکھ چکے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب سے خود واقفیت نہیں ہے۔ جہاں مغرب میں مدت تک عام تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی ملتی رہی اور اسطرح پر عام تعلیم کے پھیلنے سے اور ادھر اپنے مذہب سے واقفیت حاصل کر کے سمجھدار لوگوں نے عیسائی مذہب کے اصول کی غلطی کو دیکھ لیا ہندوستان میں اسکے برعکس ظہور میں آیا یعنی مادی تعلیم پر تو پوری کوشش صرف کی گئی اور مذہبی تعلیم کی طرف سے بالکل لاپروائی کی گئی اس لیے جوں جوں مادی مغربی تعلیم کا چرچا پھیلا مذہب کی تعلیم گم ہو گئی پس جو کچھ لاپروائی مذہب کی طرف سے ایسے لوگوں کے دلوں میں پائی جاتی ہے وہ محض اسوجہ سے ہے کہ

وہ اپنے مذہب کے اصول سے اور انکے فلسفہ سے آگاہ نہیں۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ جس طرح مغرب میں مذہب کی واقفیت کے سبب سے عیسائی مذہب سے بیزاری پیدا ہوئی ہے اس کے برعکس ہندوستان میں اسلامی مذہبی تعلیم سے ناواقفیت کے سبب سے اسلام کی طرف سے بعض دلوں میں ایک لاپروائی اور غفلت سی پیدا ہو گئی ہے جس نے اعمال میں مسلمانوں کو سُست کر دیا ہے۔

جو کچھ ہم نے یہاں اسلام کے متعلق کہا ہے کہ دراصل مذہبی ناواقفیت کی وجہ سے مسلمانوں میں عملی رنگ میں سُستی پیدا ہو گئی ہے اور کہ مذہب اسلام اپنے اندر ایک ایسی طاقت رکھتا ہے کہ وہ ہر ایک مادی تعلیم یا دہریت کا بڑی آسانی سے مقابلہ کر سکتا ہے اس کو ایک مسلمان کی متعصبانہ رائے نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ ایک ایسا امر ہے کہ عیسائی صاحبان بھی تعصب کو الگ کر کے اسے مانتے ہیں چنانچہ حال میں ہی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کے عیسائی ایڈیٹر نے اس بات کو کھلے الفاظ میں تسلیم کیا ہے اور جہاں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ عیسائی مذہب ایک مادی تعلیم کے مقابلہ میں ناکام ثابت ہوا ہے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اسلام کے اصول میں ایسی کوئی بات نہیں جو سائنس کے رُو سے غلط ٹھہرتی ہو۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے "اس میں کچھ شک نہیں کہ مادی تعلیم کا اثر ہندوستان کے مذاہب پر یہ ہوا ہے کہ عقائد میں کمزوری واقع ہوئی ہے۔ اور ہندوستانی طالب علم جو کالجوں میں سے ہو کر نکلے ہیں وہ اپنے آباؤ اجداد کے عقائد پر قائم نہیں رہے۔ یہ تو غالباً ایک ظاہر بات تھی کہ انگریزی تعلیم کا اثر ایک ہندو پر یہ ہوتا کہ اسکے عقائد متزلزل ہو جاتے لیکن ایک مسلمان پر ایسا اثر ہونا ضروری نہ تھا کیونکہ جس شخص نے سائنس میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کی ہے اس کے لیے بھی اسلام کے قبول کرنے میں عقلی مشکلات کا کچھ سامنا نہیں۔ پس مسلمانوں کے عقائد میں کمزوری واقع ہونا اس وجہ سے نہیں ہے کہ علم یعنی سائنس اور طالب علم کے ایمان میں اصولی طور پر کوئی تضاد ہے بلکہ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ دن رات کالج میں ایک مادی تعلیم میں ڈوبا رہتا ہے۔ اس کی شہادت ہمیں اس امر سے بھی ملتی ہے کہ ایک ہندوستانی کالج میں اکثر مسلمان طلبا ایسی حالت میں ہو کر نہیں گذرتے جیسے کہ انگریز انڈر گریجوایٹ جنپر ایک زمانہ مذہب اور دہریت میں کشمکش کا گذرتا ہے بلکہ مسلمان طالب علم یونہی مذہب سے الگ ہو جاتے ہیں اور مذہب کے متعلق لاپرواہ سے ہو جاتے ہیں۔ دوسرے معاملات جیسا کہ معاملات ملکی یا تمدنی اصلاح یا قوم کی ترقی ان چیزوں کی انکی آنکھوں میں وقعت بہت زیادہ ہو جاتی ہے اور مذہب کو اسطرح پر پیچھے ڈالدیا جاتا ہے کہ اسکا احساس بھی انہیں کوئی نہیں رہتا۔"

اسی مضمون میں ایک بات اور قابل ذکر ہے۔ اسلام پر بڑا حملہ یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں شریعت نے چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی انسانوں پر ایک بوجھ ڈالا ہے یعنی پابندیاں اور قیدیں مقرر کر رکھی ہیں۔ ہمارا معجزز تو یہ امید رکھتا ہے کہ ان قیود سے گھبرا کر آخر مسلمان عیسائی مذہب کی طرف رجوع کریں گے اور درحقیقت جب ہم دیکھتے ہیں

توامرواقع بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ نو تعلیم یافتہ مسلمانوں کی مذہب سے لاپرواہی یا بیقیدی جو کچھ ہے وہ عملی رنگ میں ہے یا ان امور میں جو عملی طور پر بجالانے پڑتے ہیں۔ تو ایسی صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا پادری صاحبان کی ایسی امیدیں صحیح ہیں کہ جوں جوں مسلمان تعلیم یافتہ ہوجاویں گے وہ اسلامی شریعت کی پابندیوں اور قیود سے گھبرا کر عیسائی مذہب کی طرف مائل ہوجائیں گے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں ایک نظر ان دونوں مذہبوں کے اصول پر ڈالنی چاہیئے۔ کیونکہ مقدم اصول ہیں اور چھوٹے چھوٹے امور میں جو پابندیاں ہیں وہ محض فروع ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عیسائی صاحبان کا یہ اپنا اقرار ہے کہ نئی تعلیم کے سامنے عیسائی مذہب کے اصول ٹھہر نہیں سکتے اور بہت سے لوگوں نے جن میں اسقدر اخلاقی جرأت تھی عیسائی مذہب کے ان اصول کو جو اُنیس سو برس سے چلے آتے تھے خیرباد کہدیا ہے اور کھُلے طور پر دہریت کو قبول کرلیا ہے۔ برخلاف اسکے اسلام کے مذہبی مخالف بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ اسلام کے اصول پر سائنس کا کوئی حملہ نہیں پڑتا پھر ایسی امید رکھنا کہ مسلمان تعلیم پاکر عیسائی مذہب کی طرف آئیں گے ایک خیال خام ہے امرواقع اس کے خلاف ہے یعنی عیسائی تعلیم پاکر عیسائیت کے اصول کو چھوڑتے چلے جاتے ہیں اور ایسے مذہبی اصول پر قایم ہوتے جاتے ہیں جو اسلام نے سکھائے ہیں۔ پس یہ امید تو مسلمانوں کو رکھنی چاہیئے کہ عیسائی تعلیم پاکر اسلام میں داخل ہوجائیں گے کیونکہ اسوقت بھی وہ مائل ہوتے چلے جارہے ہیں مگر کوئی شخص یہ نہیں دکھا سکتا کہ جو تعلیم یافتہ مسلمان مذہب کی طرف سے کسی قدر آزادی اور بیقیدی بھی دکھلاتے ہیں وہ بھی اس کے اصول سے بیزار ہوں یا عیسائی مذہب کے اصول کو پسند کرنیوالے ہوں۔ حالانکہ عیسائیوں میں ایسے تعلیم یافتہ بکثرت ہیں جو عیسائیت کے اصول سے بیزار یا اسلام کے اصول کو پسند کرنیوالے ہیں۔ اب باقی یہ سوال رہتا ہے کہ شریعت کی پابندیوں کو چھوڑ کر اسلام کے اصول کو نہ چھوڑنیکا کیا فائدہ ہے کیونکہ جب ایک حصہ رد کردیا گیا تو دوسرا حصہ کیا فائدہ دے سکتا ہے؟ سو جہانتک ہم دیکھتے ہیں عملی بیقیدی کی وجہ بھی اصول اسلام سے ناواقفیت اور ایمان کی کمزوری ہی معلوم ہوتی ہے۔ شرعی پابندیاں کیا چیز ہیں؟ وہ ان اصول پر جو اسلام نے سکھائے ہیں پورے طور پر قایم ہونیکی ایک راہ ہے۔ پس جب اصول پر پورا پورا ایمان ہو۔ تو عملی کمزوری اور بیقیدی کی کوئی وجہ نہیں۔ سو آخر بات وہی آرہتی ہے کہ ساری بلا صرف مذہب کی طرف سے لاپروائی کی وجہ سے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پانچ وقت نماز پڑھنا یا تیس دن تک روزے رکھنا یا شراب اور قمار بازی سے قطعی پرہیز کرنا یا بدنظری سے بچنا یہ بڑی بڑی قیود اور مشکلات ہیں لیکن جب ایک آدمی یقین کامل کے ساتھ سمجھ لیتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی توحید پر پوری طرح قایم ہونیکی یہی راہ ہے تو اس کے لیے یہ مشکلات مشکلات نہیں رہ جاتیں جیساکہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے واستعینوا بالصبر والصلوٰة وانها لكبيرة الا على الخاشعين الذين يظنون انهم ملقوا ربهم یعنی

"خدا کا قرب حاصل کرنیکے لیے صبر یعنی مصائب کی برداشت جیسے روزہ وغیرہ .... اور صلوٰۃ یعنی نماز اور دعا کے ساتھ مدد طلب کرو اس میں شک نہیں کہ ... یہ امور بھاری معلوم ہوتے ہیں مگر ان لوگوں کیلیے یہ کچھ بھی بھاری نہیں جن کو یہ یقین حاصل ہو گیا ہے کہ یہی راہیں اللہ تعالیٰ کو پانیکی ہیں" سو جس صورت میں مادی تعلیم کا اصول اسلام پر کوئی حملہ نہیں ہے تو عملی پابندیوں کی طرف ان لوگوں کا واپس آنا کچھ مشکل امر نہیں جو اصول کو مانتے مگر انکی اصل حقیقت سے بیخبر ہونیکی وجہ سے عملی رنگ میں سست یا بیقید ہو رہے ہیں۔

دوسری تجویز عیسائی مذہب کو کامیاب بنانیکی بشپ صاحب مدراس کی طرف سے ہے۔ یہ بشپ صاحب مدت سے پادری صاحبان اور ان لوگوں کو جو پادریوں کو مدد دیتے ہیں اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ بڑے بڑے شہروں میں مشن قایم کرنا یا بڑی ذاتوں کے ہندوؤں کو عیسائی مذہب میں لانیکی کوشش کرنا روپیہ کو ضایع کرنا ہے۔ اور کہ انکی بجائے چوہڑوں اور پاریہ لوگوں کی طرف مشنریوں کو توجہ کرنی چاہیئے۔ چنانچہ کسی گذشتہ رسالہ میں ہم نے انکے ایک ایسے مضمون کا حوالہ دیا بھی تھا جس میں انہوں نے یہ ثابت کیا تھا کہ عیسائی مذہب کو صرف ہندوستان کی نیچ ذاتوں میں جیسے چوہڑے چمار ہیں کامیابی ہوئی ہے۔ اور تعلیم یافتہ لوگوں میں قطعاً کوئی کامیابی نہیں ہوئی اسی کی تائید میں وہ اب بھی اپنی تجویز پیش کرتے ہیں جو بعض مشنریوں کو ناگوار گذرتی ہے چنانچہ حال میں ہی انہوں نے اپنی صفائی ذیل کے مضمون میں پیش کی ہے۔

"جو تجویز مینے پیش کی تھی وہ یہ تھی کہ ہمکو اپنی کوششیں خصوصیت کے ساتھ ان قوموں پر لگانی چاہئیں جو عیسائی مذہب کے قبول کرنیکے لیے رضامند اور تیار ہیں خواہ وہ شمال میں ہوں اور خواہ جنوب میں۔ اور ان قوموں پر کوشش کم خرچ کرنی چاہیئے جن کو گذشتہ پچاس سال سے انجیل کے جاننے کا پورا موقع دیا جاتا رہا ہے۔ مگر انہوں نے اس کے قبول کرنیکے لیے کوئی مستعدی ظاہر نہیں کی۔ مجھے افسوس ہے کہ اس تجویز پر کسی کو دکھ پہنچے کیونکہ مَیں یہ یقین رکھتا ہوں کہ یہ تجویز عام عقل انسانی پر اور اس نمونہ پر مبنی ہے جو ہمارے مبارک خداوند اور اس کے حواریوں نے دکھایا۔ مینے خود سولہ سال سے شمالی ہند کے شہروں کی تعلیم یافتہ جماعت اور اونچی ذاتوں میں مشنری کام کو دیکھا ہے اور گذشتہ سات سال سے پاریہ لوگوں اور جنوبی ہند کی دوسری نیچ قوموں میں اس کام کو دیکھ رہا ہوں اور مینے گذشتہ صدی کی ہندوستان میں موجودہ مشنوں کی تاریخ کو بھی مطالعہ کیا ہے اور مَیں اس بات پر کامل یقین رکھتا ہوں کہ ہندوستان میں اگر کبھی تبدیلی مذہب عام طور پر ہو سکتی ہو تو وہ صرف اسی راہ سے ہو سکتی ہے کہ پاریہ قوم اور ہند کی دوسری اصلی قوموں کو اپنے مذہب میں لایا جاوے اور ان میں ترقی کرنیکی قابلیت پیدا کیجاوے اور اس لیے کلیسیا کی صحیح پالسی آیندہ پچاس سالوں کے لیے یہی ہے کہ جہاں تک

ممکن ہو اس کام پر کل کوشش صرف کیجاوے اور اسی کو تکمیل کو پہنچایا جاوے۔ جنوبی ہندوستان میں جس قدر مشنری کام کا تجربہ ہے وہ یہی بات ثابت کرتا ہے کہ سب سے عمدہ طریق شودروں تک پہنچنے کا یہی ہے کہ پہلے پاریہ قوم کو عیسائی مذہب میں لایا جاوے .... پھر جبکہ شودر جو آبادی کا نوے فیصدی حصہ یا اس سے بھی زیادہ ہیں عیسائی ہو جاویں تو عیسائی مذہب کی فتح ہے اور اُسوقت ہندوستان ایک عیسائی ملک ہوگا"

مشنریوں کی یہ کوشش کہ ایک رذیل قوم کو جسے ہندوؤں نے انسانوں میں ہی شامل نہیں کیا۔ تعلیم دیکر انہیں ترقی کی قابلیت پیدا کیجائے بیشک انسانی ہمدردی پر مبنی ہو سکتی تھی اگر اصل غرض صرف انکو عیسائی بنانا نہ ہوتی۔ اور یہ بھی کوئی قابل اعتراض امر نہ ہوتا اگر پادریصاحبان کی غرض محض ان لوگوں کی جہالت اور ناواقفیت اور انکی گری ہوئی حالت سے فائدہ اٹھانیکی نہ ہوتی۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ اس قابل ہی نہیں کہ وہ مذہب کی حقیقت کو سمجھ سکیں یا عیسائی مذہب کے پیچیدہ اصول کو سمجھ سکیں انکو عیسائی مذہب میں داخل کرنیسے سوائے تعداد بڑھانیکے اور کوئی فایدہ بھی ہے؟ اگر یہ لوگ عیسائی ہوتے ہیں تو صرف اس خیال پر کہ انکے ناموں کے ساتھ جو ذلت لگی ہوئی ہے وہ ایک دو نسلوں میں جاتی رہیگی اور جیساکہ پنجاب کے چوہڑوں کی حالت میں ہوا ہے۔ دوسری نسل میں وہ صاحب بنکر اپنے مالکوں سے بھی بڑھ جائیں گے۔ تعجب ہے کہ ایک طرف عیسائی صاحبان اسلام پر یہی الزام یہ لگاتے ہیں کہ لوگوں کو بجبر مسلمان کیا گیا اور دوسری طرف اس تہذیب کے زمانہ میں خود ایسی کارروائیاں کرتے ہیں۔ جو بجبر دین میں داخل کرنیسے بھی بدتر ہیں یعنی لوگوں کی جہالت سے فایدہ اٹھاتے ہیں۔ پنجاب کے جو چوہڑے عیسائی ہوئے ہیں انکے متعلق خود پادریصاحبان نے تسلیم کیا ہے کہ انکو عیسائی مذہب کی کچھ بھی واقفیت نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی بپتسمہ دینے کیلئے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ کہ انکو عیسائی مذہب کی کچھ خبر ہو۔

بابی مذہب (۳)

بہاء اللہ کی شریعت

اگرچہ ہم پچھلے پرچہ میں یہ ذکر کر چکے ہیں کہ بابی مذہب بہت سے فرقوں میں منقسم ہو گیا ہے لیکن اس میں بہاء اللہ کے پیروؤں کا ہی زیادہ زور ہے اور غصن اعظم اور غصن اکبر کے پیرو ہر دو بہاء اللہ کو مانتے ہیں اس لیے اب بابی مذہب دراصل بہائی مذہب ہی ہے۔ بہاء اللہ کی سب سے بڑی تصنیف کتاب الاقدس خیال کی جاتی ہے۔ اور اس کتاب میں وہ شریعت بھی ہے جو بہاء اللہ نے اپنے پیروؤں کو دی تھی اور اس میں اسکے دعاوی بھی بڑے بسط کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ ان احکام کی پیروی کے متعلق خود کتاب الاقدس میں بہاء اللہ نے یہ لکھا ہے

تمسکوا بالکتاب الاقدس الذی انزله الرحمن من جبروته المقدس المنیع انه لمیزان الله بینکم یوزن به کل الاعمال من لدن قوی قدیر۔ یعنی کتاب الاقدس کو مضبوط پکڑو جو کہ رحمٰن نے اپنی مقدس اور مضبوط طاقت کے ساتھ نازل کی ہے یہ تمہارے درمیان خدا کی میزان ہے جس سے قوی قدیر کی طرف سے کل اعمال تولے جاویں گے۔ صفحہ ۴۸۔ اسی کتاب کے شروع میں اس کا مصنف لکھتا ہے کہ اس نئے سلسلہ میں یعنی بہار اللہ کے سلسلہ میں جو باب کے سلسلہ کو منسوخ کرنیوالا ہے دو باتیں سب آدمیوں پر فرض کی گئی ہیں اول یہ کہ وہ اُس مظہر کو خدا کا ظہور سمجھیں اور دوسرا یہ کہ ان خدائی حدود یعنی احکام پر جو کتاب الاقدس میں دیئے گئے ہیں پورے طور پر عمل کریں کیونکہ وہ لکھتا ہے لانهما معا لا یقبل احدهما دون الاخر۔ یعنی یہ دونوں باتیں اکٹھی ہونی چاہئیں اور ان میں سے ایک سوائے دوسری کے قبول نہیں ہو سکتی یعنی اگر شریعت پر عمل کیا جائے اور بہار اللہ کے دعووں کو تسلیم نہ کیا جائے تو وہ بھی فضول ہے اور اگر دعوے کو تسلیم کیا جائے اور شریعت پر عمل نہ کیا جاوے تو وہ بھی فضول ہے۔ پس چونکہ بہار اللہ نے اپنے احکام کی پیروی کو اسقدر ضروری سمجھا ہے اس لیے اس کے دعاوی پر غور کرنے سے پہلے ہم ان احکام کو بیان کرتے ہیں جو اس مذہب کی شریعت کہلاتی ہے۔

جو احکام کتاب الاقدس میں پائے جاتے ہیں وہ اسلامی احکام میں ہی کسی قدر تغیر و تبدل ہے۔ اور تبدیلی کی غرض محض یہ معلوم ہوتی ہے کہ کسی قدر تخفیف ہو جائے چنانچہ اسلام کے چاروں اصولی احکام یعنی نماز روزہ زکوٰۃ اور حج کو ضروری قرار دیا ہے مگر ان میں تھوڑا تھوڑا ادل بدل کر دیا گیا ہے مثلاً اسلام میں اگر پانچ نمازیں ہیں تو بہار اللہ نے انکی تعداد کم کر کے تین نمازیں اپنے پیرووں پر فرض کی ہیں۔ اور ان تینوں نمازوں میں کل رکعتوں کی تعداد نو بتائی گئی ہے۔ قد کتب علیکم الصلوٰۃ تسع رکعات من الله منزل الآیات حین الزوال وفی البکور والاصال وعفونا عدة اخرى۔ اس میں شیعہ مذہب کا کچھ اثر بھی پایا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی تین اوقات میں ہی نماز پڑھتے ہیں اور ظہر اور عصر کو اور مغرب اور عشاء کو جمع کر لیتے ہیں۔ نماز کو سن بلوغت پر پہنچنے سے فرض قرار دیا گیا ہے نماز کی صورت قریباً وہی معلوم ہوتی ہے جو اسلام میں ہے اور سجدہ کا حکم تو صاف الفاظ میں ہے۔ مسلمان کعبہ کی طرف مُنہ کرتے ہیں اس کی بجائے بہار اللہ نے عکا کی طرف نماز میں مُنہ پھیرنے کی ہدایت کی ہے۔ واذا اردتم الصلوٰۃ فولوا وجوهکم شطری الاقدس المقام المقدس الذی جعله الله مطاف الملأ الاعلیٰ ومقبل اهل مدائن البقاء ومصدر الامر لمن فی الارضین والسموات۔ یہ سب تعریف مقام عکا کی ہے جہاں بہار اللہ مدت تک قید خانے میں رہا۔ جماعت کے حکم کو منسوخ قرار دیا گیا ہے اور یہ ہدایت ہے کہ سوائے نماز جنازہ کے باقی سب نمازیں اکیلے اکیلے پڑھی جاویں۔ جیسا کہ لکھا ہے کتب علیکم الصلوٰۃ فرادیٰ قد رفع حکم الجماعة الا فی صلوٰۃ المیت

نماز کے پہلے وضو کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ بوڑھے آدمیوں اور بیماروں کے لیے نماز بالکل معاف کر دی گئی ہے مسافر کے لیے بجائے نماز کے حسب ذیل ہدایت ہے۔ ولکم و لھن فی الاسفار اذا نزلتم و استرحتم المقام الامن مکان کل صلوٰۃ سجدۃ واحدۃ واذکروا فیھا سبحان اللہ ذی العظمۃ والاجلال والموھبۃ والافضال والذی عجز یقول سبحان اللہ انہ یکفیہ بالحق انہ لھو الکافی الباقی الغفور الرحیم و بعد اتمام السجود لکم و لھن ان تقعدوا علی ھیکل التوحید و تقولوا ثمانی عشرۃ مرۃ سبحان اللہ ذی الملک والملکوت۔ یعنی سفر میں بجائے نماز کے ایک ہی سجدہ کافی ہے اور اسکے بعد اٹھارہ مرتبہ تسبیح۔

دوسرا اصول اسلامی روزہ ہے۔ اسکو بھی بہاء اللہ نے فرض ٹھیرایا ہے مگر چونکہ بابی مہینہ اُنیس دن کا ہوتا ہے (سال اُنیس مہینوں کا ہوتا ہے اسطرح سال میں ۳۶۱ دن ہوئے) اس لیے روزوں کی تعداد بھی بجائے تیس یا انتیس کی اُنیس رہ جاتی ہے۔ بیمار اور مسافر کے لیے روزہ بالکل معاف ہے اور ایسا ہی حاملہ عورت کے لیے اور دودھ پلانیوالی کے لیے بھی معاف ہے۔ روزوں کے مہینہ سے پہلے چند دن کھانے پینے کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں اور نیروز کو عید کا دن قرار دیا گیا ہے۔ روزہ طلوع آفتاب سے غروب تک ہے۔

زکوٰۃ کو بھی بہاء اللہ نے فرض قرار دیا ہے۔ نصاب کے متعلق اسی جگہ یہ لکھا ہے کہ ہم اس کے متعلق آیندہ تم کو ہدایت دیں گے۔ مگر اس کے بعد کوئی ہدایت زکوٰۃ یا اس کے نصاب کے متعلق کتاب الاقدس میں نہیں ملتی البتہ اس سے پہلے ایک ہدایت ہے کہ سو مثقال سونے میں سے اُنیس مثقال بہاء اللہ کو دیئے جاویں جس کا ذکر بعد میں کیا جاویگا۔ بیت اللہ کا حج سب بابیوں پر فرض کیا گیا ہے چنانچہ صفحہ ۱۱ پر یہ ہدایت موجود ہے۔ قد حکم اللہ لمن استطاع منکم حج البیت دون النساء عفی اللہ عنھن رحمۃ من عندہ۔ یعنی سوائے عورتوں کے جس شخص کو استطاعت ہو اس کے لیے خدا کا یہ حکم ہے کہ وہ بیت اللہ کا حج کرے۔ مگر عورتوں کو اللہ نے رحم کر کے معاف کر دیا ہے۔ تعجب ہے کہ اسقدر شریعت اسلامی میں تبدیلیوں کے باوجود حج بیت اللہ کو قائم رکھا ہے مگر ہم نہیں سمجھتے کہ کوئی بابی اس حکم کی تعمیل کرتا ہو۔ نہ ہی یہ حکم کسی اور شریعت سے بابیوں کے نزدیک منسوخ ہوا ہے۔

تعدد ازدواج کو بھی بہاء اللہ نے جایز رکھا ہے مگر دو بیویوں سے زیادہ نکاح میں لانیکی اجازت نہیں۔ کتاب الاقدس کے صفحہ ۲۱ پر بہاء اللہ لکھتا ہے۔ کتب اللہ علیکم النکاح ایاکم ان تجاوزوا عن اثنتین والذی اقتنع بواحدۃ من الاماء استراحت نفسہ و نفسھا ومن اتخذ بکرا لخدمتہ لا باس علیہ کذالک کان الامر من قلم الوحی بالحق مرقوما تزوجوا یا قوم لیظھر منکم من یذکرنی بین عبادی۔ یعنی نکاح تم پر فرض ہے مگر دو سے زیادہ نکاح نہ کرو اور جو شخص ایک ہی عورت پر کفایت کرتا ہے

وہ اس کے لیے اور اس عورت کے لیے دونوں کے لیے اچھا ہے۔ اور جو شخص ایک کنواری عورت اپنی خدمت کے لیے رکھے تو کوئی حرج نہیں۔ اے میری قوم نکاح کرو تا کہ تم میں سے وہ لوگ ظاہر ہوں جو میرا ذکر میرے بندوں میں کریں۔ مہر کی ادائیگی نکاح کے لیے ضروری ٹھہرائی گئی ہے مگر اس کی حد شہروں اور گاؤں کے لیے الگ الگ مقرر کر دی گئی ہے۔ یعنی شہر کے لیے اُنیس مثقال سونا۔ اور گاؤں کے لیے اسیقدر چاندی۔ اس سے زیادہ بھی مہر دیا جاسکتا ہے مگر پچانوے مثقال سے کسی صورت میں زیادہ نہیں ہونا چاہیئے۔ نکاح اور طلاق کے متعلق کچھ اور بھی ہدایات ہیں۔ جب کوئی شخص سفر کے لیے باہر نکلے تو اسپر فرض ہے کہ اپنی عورت کے ساتھ ایک میعاد مقرر کرے کہ اسقدر عرصہ میں وہ واپس آجائیگا۔ پھر اگر اس میعاد کے گذرنیکے بعد کوئی واقعی عذر اسکو ایسا پیش آجائے کہ اس مدت میں وہ واپس نہ ہو سکتا ہو تو اسپر فرض ہے کہ اس عذر کی اطلاع اپنی عورت کو دے۔ اور سخت کوشش اس امر کی کرے کہ جسقدر میعاد عذر کی بنا پر لی گئی ہے اس کے اندر واپس ہو جائے۔ لیکن اگر وہ یا تو عذر ہی نہ کرے اور پہلی مقررہ میعاد کے بعد واپس نہ آئے اور یا اگر عذر حقیقی اس کا کوئی ہو اور دوسری دفعہ کی میعاد مقررہ کے اندر واپس نہ آئے تو عورت کو نو مہینے انتظار کرکے دوسری جگہ نکاح کر لینا چاہیئے۔ طلاق کے متعلق یہ حکم ہے کہ اگر عورت اور خاوند میں کوئی کدورت واقع ہو جائے یا باہمی نفرت ہو تو مرد فی الفور طلاق نہیں دے سکتا بلکہ اسکو ایک سال تک انتظار کرنا چاہیئے۔ پھر اگر اس انتظار کے بعد اصلاح نہ ہو تو خاوند طلاق دے سکتا ہے۔ مگر بعد طلاق کے جبتک عورت دوسری جگہ نکاح نہ کرلے رجوع کا ہر وقت اختیار ہے۔ اگر خاوند اور عورت دونوں سفر کرتے ہوں اور سفر میں ہی ان میں کوئی اختلاف ہو جائے تو خاوند پر واجب ہے کہ ایک سال کا نفقہ دے کر عورت کو اپنے گھر کو واپس کر دے۔ طلاق کے بعد عدت بھی ہے مگر اس کی میعاد نہیں بتائی گئی۔

وراثت کے قانون میں بھی اصولاً اسلامی قانون وراثت کی پیروی کی گئی ہے مگر ورثاء کے حصص کی ایک عجیب ہی تقسیم ہے۔ اصل الفاظ کتاب الاقدس کے یہ ہیں۔ قد قسمنا المواریث علیٰ عدد الزاء منها قدر لذریاتکم من کتاب الطاء علی عدد المقت وللازواج من کتاب الحاء علی عدد التاء والفاء وللاباء من کتاب الزاء علی عدد التاء والکاف وللامهات من کتاب الواو علی عدد الرفیع وللاخوان من کتاب الهاء عدد الشین وللاخوات من کتاب الدال عدد الراء والمیم وللمعلمین من کتاب الجیم عدد القاف والفاء۔ یعنی ورثہ کو عدد زاء یعنی سات حصوں پر تقسیم کیا جاوے۔ ایک حصہ لڑکوں لڑکیوں کے لیے۔ ایک حصہ خاوند یا عورت کے لیے۔ ایک باپ کے لیے۔ ایک ماں کے لیے۔ ایک بھائیوں کے لیے۔ ایک بھینوں کے لیے۔ ایک معلمین کے لیے حصوں کی نسبت حساب جمل میں بتائی گئی ہے۔ اولاد کے لیے کتاب الطاء علیٰ عدد المقت یعنی ۹×۶۰=۵۴۰

ازواج کے لیے ۸ × ۴۸۰۔ باپ کے ۷ × ۴۲۰۔ ماں کے لیے ۶ × ۳۶۰۔ بھائیوں کے لیے ۵ × ۳۰۰۔ بہنوں کے لیے ۴ × ۲۴۰۔ معلموں کے لیے ۳ × ۱۸۰۔ یا نسبت نکالنے سے علی الترتیب یہ حصص ہوئے۔ ۸۱ و ۶۴ و ۴۹ و ۳۶ و ۲۵ و ۱۶ و ۹۔ اس حکم کے ساتھ ہی یہ الفاظ بڑھائے گئے ہیں انا لما سمعنا ضجیج الذریات فی الاصلاب زدنا ضعف مالھم ونقصنا عن الاخری۔ یعنی اولاد کا حصہ دوگنا کر دیا گیا اور دوسروں کا کم کر دیا گیا۔ اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کی اولاد نہ ہو تو اولاد کا حصہ بیت العدل میں جائے گا۔ (بیت العدل کیا چیز ہے اسکی تشریح آگے چلکر کیجائیگی) اور اس سے یتیموں اور بیواؤں کی مدد کی جائیگی۔ اور اگر اولاد ہو مگر دوسرے ورثا جن کو اس تقسیم کے رو سے حصص دیئے جانے چاہئیں موجود نہ ہوں تو کل مال کی دو تہائی اولاد میں تقسیم ہوگی اور ایک تہائی بیت العدل میں دیجائیگی۔ اگر نہ اولاد ہو اور نہ یہ دوسرے ورثا ہی ہوں مگر اور قریبی رشتہ دار موجود ہوں جیسے بھائیوں اور بہنوں کی اولاد تو دو تہائی ترکہ کی انکو پہنچے گی۔ اگر وہ بھی نہ ہوں تو یہی حصہ ماں اور باپ کے بھائیوں بہنوں کو دیا جاویگا۔ یا اگر وہ مرچکے ہوں تو انکی اولاد کو۔ اور باقی ایک تہائی ہر صورت میں بیت العدل میں جائیگی۔ اگر کوئی وارث بھی موجود نہ ہو تو کل مال متروکہ بیت العدل میں جائیگا۔ لیکن اس ساری تقسیم میں رہائش کا مکان اور پہننے کے کپڑے متوفی کے شامل نہ ہونگے وہ صرف لڑکوں کا حصہ ہوں گے لڑکیوں کو یا دوسرے رشتہ داروں کو ان میں سے کوئی حصہ نہیں ملیگا۔ یہانتک کہ عورت یا خاوند کو بھی نہیں ملیگا۔ (صفحہ ۸ و ۹ کتاب الاقدس)

کچھ متفرق ہدایات بکھری ہوئی اور بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ایک یہ ہے کہ انیس سال گذرنے کے بعد گھر کا سارا اسباب بدل دو۔ کتب علیکم تجدید اسباب البیت بعد انقضاء تسع عشرۃ سنۃ کذالک قضی الامر من لدن علیم خبیر۔ اصل میں انیس کے ہندسہ کو بابیوں میں ایک خاص عزت حاصل ہے۔ چنانچہ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ انکا مہینہ بھی انیس دن کا ہوتا ہے اور سال انیس مہینوں کا ہوتا ہے۔ شاید اسی مناسبت کے لحاظ سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ انیس سال بعد گھر کا اسباب بدل دو۔ اسی طرح پر مہر کے لیے انیس مثقال سونا یا چاندی مقرر کی گئی ہے جس کے پاس سو مثقال سونا ہو وہ انیس مثقال خدا کو دے۔ یہ انیس دن کا مہینہ اور انیس مہینوں کا سال علی محمد باب کی ایجاد ہے اور اسی سے بہاء اللہ نے لیا ہے۔ مگر اس کی اصل وجہ معلوم نہیں۔ یہ بھی حکم ہے کہ جہانتک ممکن ہو گھر بہت خوشنما بنائے جایا کریں اور انکی بہت اچھی طرح حسب حیثیت آرائش کی جایا کرے۔ لیکن ان میں کوئی تصویر نہ رکھی جائے۔ یہ بھی حکم ہے کہ کوئی شخص آیات الٰہی یعنی بہاء اللہ کی تصانیف کو کھڑے ہوکر لوگوں کو ہرگز نہ سنائے۔ پڑھنے والے کو چاہیئے کہ وہ ایک مرتفع پلیٹ فارم پر کرسی بچھاکر بڑے ادب اور تکریم سے بیٹھکر سنائے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ "خدا اس بات کو بہت عزیز رکھتا ہے کہ تم لوگ کرسیوں اور بلند

پلیٹ فارموں پر نشست کیا کرو۔ یہ بھی حکم ہے کہ کسی کا ہاتھ کبھی مت چومو۔ یہ بھی حکم ہے کہ قمار بازی اور افیون خوری منع ہیں۔ حکم ہے کہ گرمیوں کے موسم میں چوبیس گھنٹوں کے درمیان دونوں پاؤں کو ایک دفعہ غسل دینا چاہیئے۔ اور موسم سرما میں ۷۲ گھنٹوں میں ایک دفعہ انہیں دھونا چاہیئے۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی باریک تفصیلات لکھی ہیں جن کا یہاں درج کرنا تضییع اوقات کا موجب ہوگا۔ اس لیے انکو نہیں لکھا جاتا۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ بہاء اللہ نے کوئی مکمل شریعت اپنے پیرووں کے لیے تجویز کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی ہدایات لکھدی ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ بہت ناقص قانون ہے جس میں سب سے پہلی اور بڑی بے سمجھی کی بات تو یہ ہے کہ کوئی بنیادی اصول بیان ہی نہیں کیے گئے۔ اور اکثر ایسے معاملات جو نہایت ضروری تھے اس قانون میں شامل ہی نہیں کیے گئے۔ یہ ایسے نقص ہیں جو اُن لوگوں سے سرزد نہیں ہوسکتے جن میں وضع قوانین کے سارے لوازم موجود ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا شاخ قوانین سے آگے چلکر بعض جرائم کی تعزیرات کے متعلق بھی احکام اور ہدایات نافذ کی گئی ہیں۔ جو ذیل میں درج ہیں۔ حکم ہے کہ "جو شخص عمداً کسی کے گھر کو آگ لگائے اس شخص کو جلا دیا جائے" لیکن آگے چلکر جہاں خون کر دینے کی سزا موت تجویز کی گئی ہے وہاں اس جلانیکی سزا کی شدت میں بھی تخفیف کیگئی ہے اور لکھا ہے کہ "اگر تم انکو عمر قید کا حکم دو تو کتاب میں تم پر اس بات کا کوئی گناہ نہیں"۔ بہائی مذہب کی اخلاقی حالت کا اس سے بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس میں زناکاری کو کسی جرم فوجداری میں داخل نہیں کیا گیا۔ بلکہ اتنا بھی نہیں کہ یورپ کی طرح نقصان رسیدہ فریق کو کوئی ہرجانہ ہی دلانا تجویز کیا گیا ہو۔ اس کے لیے صرف یہی لکھا ہے "تحقیق خدا نے حکم دیا ہے کہ ہر ایک مرد اور عورت جو زنا کا ارتکاب کریں وہ بیت العدل میں ۹ نو مثقال سونا داخل کردیں"۔ پھر اگر وہی مرد یا عورت دوبارہ اس جرم میں ماخوذ ہوں تو انپر تعزیر بڑھا دی گئی ہے یعنی انسے بجائے ۹ نو کے ۱۸ اٹھارہ مثقال سونا وصول کرکے بیت العدل میں داخل کیا جائے۔ چور کی سزا جلاوطنی اور قید رکھی ہے۔ لیکن حکم ہے کہ اگر کوئی شخص اسی جرم میں تیسری دفعہ گرفتار ہو تو اسکی پیشانی پر ایک ایسا داغ لگا دیا جائے جس سے وہ جہاں جائے پہچانا جاسکے۔

اس کے بعد بہاء اللہ نے کچھ اپنے حقوق مریدوں پر قایم کیے ہیں یہ حقوق ظاہر عبارت میں خدا کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ لیکن بہائی اصطلاح میں خدا سے مراد بہاء اللہ ہے۔ اپنے لیے جو حقوق مقرر کیے ہیں انکے متعلق لکھا ہے کہ جس شخص کے پاس ایک سو مثقال سونا موجود ہو وہ اس میں سے اُنیس مثقال خدا کے خالق زمین و آسمان کو دیدے۔ (جیسا کہ اوپر تشریح کیا گیا ہے یہاں خدا سے مراد بہاء اللہ ہے) اے لوگو! خبردار رہو!! ایسا نہ ہو کہ تم اس کے فضل عظیم سے اپنی روحوں کو محروم رکھو۔ ہم نے تمکو یہ حکم دیا ہے اگرچہ ہم نہ تمھاری اور

نہ انکی جو آسمان اور زمین میں ہیں امداد کے محتاج ہیں × × × کہو! اس سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری جایداد یں پاکیزہ ہو جائیں اور تم کو وہ مرتبے نصیب ہوں جو سوائے خدا کی مرضی کے کسی کو مل نہیں سکتے۔ اے لوگو! خدا (بہاء اللہ) کے حقوق ادا کرنے میں خیانت نہ کرو اور نہ ہی ان میں اسکی اجازت کے بغیر کسی قسم کا تصرف کرو" واقعہ میں تمام املاک اور مال اسطرح راہ خدا میں خیرات کے لیے وقف کیا جاتا تھا اس کا مالک کامل اور واحد بہاء اللہ تھا اور اس کے مرنے کے بعد وہ اس کے بیٹوں کی ملکیت تھی اس کے متعلق کتاب الاقدس میں لکھا ہے "تحقیق جو مال خیرات کے لیے وقف کیا جاتا ہے وہ خدا (یعنی بہاء اللہ) کو پہنچتا ہے جو نشانات کا ظاہر کرنیوالا ہے۔ کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ اس میں کسی طرح کا تصرف مطلع وحی الٰہی کی اجازت کے بغیر کرے۔ اور اس کے بعد اس جایداد پر غصنون کو کامل قبضہ کر لینے کا حق ہوگا۔ (غصنون سے مراد بہاء اللہ کے دونوں بیٹے ہیں جنہیں ایک کا نام غصن اعظم اور دوسرے کا غصن اکبر تھا) پھر جب یہ دونوں جہان سے گذر جائیں تو اسوقت یہ جایداد بیت العدل میں داخل ہوگی بشرطیکہ اس زمانہ تک بیت العدل پورے طور پر مستحکم اور قایم ہو گیا ہو۔ غرض اسطرح تمام مال جو اس خیراتی فنڈ میں خواہ خمس اور خواہ دوسری قسم سے جمع ہوتا تھا وہ اپنی حین حیات بہاء اللہ لیتا رہا۔ پھر جب وہ مر گیا تو اس کے لڑکے حقدار ہو گئے۔ بیعت العدل جس کا ذکر یہاں آیا ہے بہائی قوم کی ایک منتخب جماعت کے زیر اہتمام تھا۔ جو اس کے امین ہوتے تھے۔ اس کا انتظام یہ تھا کہ تمام قصبوں میں جہاں کہیں بابی لوگ موجود تھے بیت العدل کی شاخیں قایم ہونیکا حکم تھا اور مقامی بابیوں میں سے کم از کم آٹھ یا ان سے زیادہ ممبر ایک شاخ کے امین اور مہتمم مقرر کرنیکا فرمان تھا۔ مگر ابھی تک بیت العدل کی بجائے بہاء اللہ کے لڑکوں کا ہی کل جایداد پر تصرف ہے۔

ہم نے بہائی شریعت کے چند بڑے بڑے قوانین لکھکر اپنے ناظرین کے آگے پیش کر دیئے ہیں۔ زیادہ تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اس لیے اسی قدر پر اکتفا کیا گیا۔ ہم کو امید ہے کہ ہمارے دوست اسکو دلچسپی سے پڑھیں گے اور حق و باطل میں فرق معلوم کرنیکی کوشش کریں گے۔ بہائی شریعت پر عملدرآمد کرنا تمام بہائی لوگوں کے لیے فرض ہے۔ کتاب الاقدس کے آغاز میں بڑے زور سے اس اصول کو لکھا گیا ہے کہ بہاء اللہ کے دعاوی کا قبول کرنا اور اس کے قوانین پر چلنا دو ایسے لازم و ملزوم امر ہیں کہ اگر ایک کو مانا جائے اور دوسرے پر عمل نہ کیا جائے تو اس کا ماننا بالکل عبث اور بیہودہ ہوتا ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص یہ مانے کہ بہاء اللہ اپنے دعووں میں صادق ہے اور اس کے قانون پر عمل نہیں کرتا تو اس کا ایسا ایمان اسکو کچھ نفع نہیں پہنچا سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس کے قانون پر عمل کرے پر اس کے دعاوی کی تصدیق نہ کرے تو اس کا عمل کرنا بھی اس کے لیے کچھ فایدہ نہیں رکھتا۔ اور جہاں کہیں کوئی امر (حکم) بیان کیا ہے وہاں ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ

گویا وہ حکم الٰہی ہے۔ جس موقع پر نماز پڑھنے کے طریق لکھے ہیں وہاں یہ لکھا ہے کہ "یہ خدا کی حدود ہیں جن کو قلم اعلیٰ نے کتب اور الواح میں رقم کیا ہے۔ خدا کے اوامر و نواہی کو مضبوط پکڑو اور ان لوگوں کی طرح مت بنو جو خود ساختہ قوانین اور رسوم کے پابند ہوتے ہیں۔ اور خدا کے قانون کو پس پشت ڈال چھوڑتے ہیں۔ کیونکہ ایسے لوگ درحقیقت وہم پرستی میں مبتلا ہوتے ہیں"۔ پھر یہ لکھا ہے "اور بڑا استنباز دل اور مخلصوں کو خدا کی حدود میں تمام فرقوں کے لوگوں کے لیے آبحیات اور وہ جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں ان کے لیے برومندی اور عقل کا چراغ ملتا ہے۔ × × × خبردار رہو کہ تم کسی بات سے پہلوتہی مت کرو جو واضح طور پر الواح میں درج ہو چکی ہے"۔

شاید ناظرین کو معلوم ہوگا کہ بعض مغربی ممالک میں بھی بہائی مذہب لوگوں نے اختیار کرلیا ہے لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ بہاء اللہ تو اپنے مذہب پر چلانیکے لیے اپنی شریعت پر عملدرآمد کا اسقدر زور دیتا ہے کہ گویا اس کے نزدیک جو شخص عامل بالشرع نہ ہو وہ بہائی ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن جن بابی لوگوں نے یورپ اور امریکہ میں اس مذہب کی اشاعت کی کوششوں کا کام اختیار کیا ہے وہ کبھی کہیں اس بات کا تذکرہ بھی نہیں کرتے کہ بہاء اللہ نے کوئی شریعت بھی مرتب کی تھی۔ اور اس شریعت پر ہر روز عملدرآمد کرنا ہر ایک فرد بہائی کے لیے فرض ہے۔ اور یہ کہ یہ ہدایات ایسی مستحکم اور مستقل ہیں کہ بہاء اللہ نے کہا ہے کہ ہزار سال آئندہ تک ان میں کوئی تغیر اور ترمیم ممکن ہی نہیں۔ بلکہ بعض امور غلط طور پر مشہور ہو گئے ہیں چنانچہ ان لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ بہاء اللہ نے ایک سے زیادہ بیویاں کرنا منع کیا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ انکی سراسر غلط فہمی اور ناواقفیت ہے۔ کیونکہ بہاء اللہ نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ مرد ایک وقت میں دو عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بہاء اللہ کے پیرو اس مذہب کو جہاں جاتے ہیں وہاں کے حالات کے لحاظ سے پیش کرتے ہیں انکو اس سے غرض نہیں کہ وہ حق کو پیش کریں خواہ کوئی قبول کرے یا نہ کرے بلکہ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح لوگ انکے مذہب میں داخل ہو جاویں خواہ اس کے اصول اور فروع پر عمل کریں یا نہ کریں۔ مغرب میں اس مذہب کو ایک ایسے اباحتی مذہب کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ کہ جس میں گویا سوائے بہاء اللہ کے ماننے کے اور کوئی پابندی نہیں ہے۔ اور چونکہ امریکہ کے زرپرست اور دنیا میں منہمک لوگ ایسے ہی مذہب کو چاہتے ہیں اس لیے ان میں سے بعض نے اس مذہب کو قبول کرلیا ہے اور انکو مشکل ہی کیا ہے ایک انسان کو خدا تو وہ پہلے ہی مانتے ہیں اب اس دوسرے کو ماننے میں کیا حرج ہے۔ اس کے بعد ہم بہاء اللہ کے دعاوی اور ان دعاوی کے مفروضہ ثبوت پر بحث کریں گے۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔

رؤیا و الہامات حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

۸-اکتوبر ۱۹۰۶ء (۱) خیر اور نصرت اور فتح انشاء اللہ تعالیٰ۔ (۲) وما منّا الّا له مقامٌ معلوم۔ ترجمہ۔ اور ہم میں سے ہر ایک کے واسطے ایک مقام معلوم ہے۔ (۳) ینصرك رجال نوحی الیهم من السماء۔ ترجمہ۔ تجھے وہ لوگ مدد دیں گے جن کو ہم آسمان سے وحی کریں گے۔ (۴) قد افلح من زکّٰها و قد خاب من دسّٰها۔ ترجمہ۔ اُس نے نجات پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اور وہ نامراد ہوا جس نے اُس کو گاڑ دیا۔ (۵) وما کنا معذّبین حتّٰی نبعث رسولاً۔ ترجمہ۔ اور ہم کسی بستی پر عذاب نہیں لاتے۔ جب تک کہ اس میں رسول نہ بھیج لیں۔ (۶) حنیفِ مسیح - ۱۶-اکتوبر ۱۹۰۶ء۔ انّی انا الرحمٰن۔ لا یخزی عبدی والایمان۔ عشقك قائمٌ و صلاتك دائمٌ۔ ۲۱-اکتوبر ۱۹۰۶ء۔ من عادا ولیًا لی فکانما خر من السماء۔ ترجمہ۔ جس نے میرے ولی کے ساتھ دشمنی کی گویا آسمان سے گرا۔ (۲) انّی موجود فانتظر۔ ترجمہ میں موجود ہوں انتظار کر۔ (۳) لا یُهَدُّ بناءك و توتٰی من ربّ کریم۔ ترجمہ۔ تیری بنا توڑی نہ جاویگی اور تو رب کریم سے دیا جائیگا۔ (۴) وضعنا عنك وزرك الذی انقض ظهرك ورفعنا لك ذکرك - فرمایا۔ "انّی موجودٌ" کا الہام ان لوگوں کے جواب میں معلوم ہوتا ہے جو خدا کے مرسل کے مقابل پر ایسی شوخی اور تکذیب سے پیش آتے ہیں کہ گویا خیال کرتے ہیں کہ خدا موجود نہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں موجود ہوں معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر کچھ ہو رہا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ کسقدر بیجا حملے اور حد سے زیادہ زبان درازیاں ہو رہی ہیں۔ (۱) اُریكَ ما اُریكَ من عجائبٍ ما یُرضیك۔ ترجمہ میں تجھے دکھاؤنگا جو کچھ دکھاؤنگا اور نیز وہ عجائب باتیں دکھاؤں گا جنسے تو خوش ہوگا۔ (۲) آپکے لڑکا پیدا ہوا ہے (یعنی آیندہ کسی وقت لڑکا پیدا ہوگا) (۳) رُدَّ الیها روحها و ریحانها۔ یعنی تمہاری بیوی کی طرف تازگی اور تازہ زندگی واپس کی گئی۔ (۴) و اِمّا تُرِیَنّ احداً منهم۔ اور اگر مخالفین یا معترضین میں سے تیرے پاس کوئی آوے (ترین کے اسجگہ یہی معنے ہیں) (۵) انّا نبشّرك بغلامٍ حلیمٍ۔ ہم تجھے ایک حلیم لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں۔ (۶) ینزل منزل المبارك۔ ترجمہ۔ وہ مبارک احمد کی شبیہ ہوگا۔ (۷) ساقیا آمدنِ عید مبارک بادت۔ (۸) ان اللّٰه مع الذین اتقوا والذین هم محسنون۔ ترجمہ۔ تحقیق اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور نیکی کرتے ہیں۔ فرمایا۔ بعض متوحش خوابیں بھی ہیں جیساکہ بعض کو قبرستان میں دفن کیا ایک گوسپند مسلوخ دیکھا معلوم نہیں اس کی حقیقت کیا ہے اور کونسا محل ہے۔

۶ اور ۷ نومبر ۱۹۰۷ء کو خدا تعالیٰ نے مخاطب کر کے فرمایا۔ ساھب لث غلاماً زکیا۔ رب ھب لی ذریۃ طیبۃ۔ انا نبشرك بغلام اسمہ یحییٰ۔ الم تر کیف فعل ربك باصحاب الفیل۔ اخذھم اللہ بقی وحدہ لاشریك معہ۔ قل جاء الحق وزھق الباطل موت قریب۔ ان اللہ یحمل کل حمل۔ من خدمك خدم الناس کلھم۔ ومن اذاك اذی الناس جمیعا۔ آمدن عید مبارک بادت عید تو ہے چاہو کرو یا نہ کرو۔ ترجمہ میں ایک پاک اور پاکیزہ لڑکے کی خوشخبری دیتا ہوں۔ اے میرے خدا پاک اولاد مجھے بخش۔ میں تجھے ایک لڑکے کی خوشخبری دیتا ہوں جس کا نام یحییٰ ہے (معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہو کہ زندہ رہنے والا) تو دیکھیگا کہ تیرا رب اُن مخالفوں سے کیا کریگا جو تیرے معدوم کرنیکے لیے حملے کرتے ہیں خدا اُنکو پکڑیگا اور یہ خدا کا بندہ اکیلا رہیگا اسکے ساتھ کوئی شریک ہوگا۔ حق آگیا اور باطل بھاگ گیا یعنی باطل بھاگ جائیگا۔ ایک شخص کی موت قریب ہے۔ خدا ہر ایک بوجھ کو آپ اُٹھائیگا (اسکے معنے ابتک معلوم نہیں ہوئے۔ آیندہ خدا قادر ہے کہ تفصیل ظاہر کر دے) جو شخص تیری خدمت کرتا ہے اُس نے ایسا کام کیا کہ گویا سارے جہان کی خدمت کی اور جو شخص تجھے دُکھ دیتا ہے اُس نے ایسا کام کیا کہ گویا ساری دنیا کو دُکھ دیا۔ اس کے بعد ایک اور الہام ہے جس کے اظہار کی اجازت نہیں۔ شاید بعد میں اجازت ہو جائے اس کا پہلا فقرہ یہ ہے۔ دیکھ میں ایک نہایت چھپی ہوئی بات پیش کرتا ہوں۔ ۲۰ نومبر ۱۹۰۷ء روز یکشنبہ کو الہام ہوا۔ ایک وبا پڑے گی۔ معلوم نہیں کہ کس قسم کی وبا ہوگی۔

لنگرخانہ:۔ میں تمام احباب اور خصوصاً احمدی انجمنوں کو خصوصیت سے اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ چندہ لنگرخانہ میں بہت کمی واقع ہوگئی ہے۔ اور ادھر علاوہ گرانی نرخ کے کثرت آمد و رفت مہمانان سے اخراجات بہت بڑھ رہے ہیں۔ دسمبر کا جلسہ بھی قریب ہے۔ سب احباب توجہ کریں۔ اور جہاں تک استطاعت ہو خاص طور پر اسکے لیے چندہ کریں۔

محمد علی

نقشہ اجرت اشتہارات در رسالہ ریویو آف ریلیجنز انگریزی و اُردو

میعاد	پورا صفحہ		نصف صفحہ		چوتھائی صفحہ	
	انگریزی	اُردو	انگریزی	اُردو	انگریزی	اُردو
سالانہ	للعہ	صہ	؎عہ	سہ	؎عہ	عہ
ششماہی	؎عہ	سہ	؎عہ	عہ	عہ	ءعہ
سہ ماہی	؎عہ	عہ	عہ	ءعہ	معہ	سے
ایک دفعہ	معہ	سے	صہ	صہ	ہے	سے

تمام درخواستیں بنام نائب ناظم میگزین۔ قادیان۔ ضلع گورداسپور آنی چاہییں۔